ڈاکٹر نبیل احمد نبیل
استاد شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، ڈویژن آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، لوئر مال کیمپس، لاہور
ڈاکٹر شیر علی
صدر شعبہ اردو، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

مستشرقین کا تاریخی، سیاسی اور ادبی پس منظر: اُردو کے سیاق و تناظر میں

Historical, political and Literary Background of Orientalists within the context of Urdu Literature

Dr. Nabeel Ahmad Nabeel,
Assistant Professor, Department of Urdu, University of Education, Division of Arts and Social Sciences, Lower Mall Campus, Lahore
Dr. Sher Ali,
Chairman Department of Urdu, Alhamd Islamic University, Islamabad

This article focuses on the immense contribution of Orientalist Urdu writers on the growth and development of Urdu language and literature from historical, political and social perspective. As world appears from the text, the earliest influence of Orientalist travelers and scholars in the Indian Sub-continent was the natural culmination of the tolerance and accommodation perpetuated by the Mughals, more importantly, during the reign of Akbar. However, direct infusion of Western thought and culture found roots planted by Portuguese and French invasion along the coastal line of India in the 18th century, a process which climaxed after the annexation of Bengal in 18th century. Although the process of influencing Urdu literature and Sociology of the Sub-continent started showing through the untiring researching and academic endeavors of the motivated by the Colonial agenda soon the appetite for Urdu writings in diversified areas like religion, politics and social milieu transcended to independent writings by English orientalists, Anglo-Indian writers and the native Christian writers of the Sub-Continent. The article thus provides a deeper insight to the Urdu reader of the cross cultural contribution of Christian writers on the Urdu and literature over period of time.

Key Words: *Immense, Contribution, Oientalist Literature, Language.*

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب اور اُردو پر اس کے اثرات

اُردو زبان و ادب کے فروغ سے قبل فارسی کی عظیم الشان روایت غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ کا حصہ رہی ہے۔ نیز یہ کہ ایسے بہت سے الفاظ جو اس وقت اُردو میں رائج ہو چکے ہیں، ان کا اشتقاق خطۂ پنجاب کی قدیم زبانوں سے ہوتا ہے اور اس لحاظ سے دکنی زبان پر بھی اس کے اثرات موجود ہیں، لیکن باقاعدہ زبان کے لحاظ سے اُردو کا سفر ابھی بہت طویل تھا، جب کہ فارسی ایران و افغانستان کے راستے خطۂ پنجاب میں داخل ہو چکی تھی، جس نے بعد میں غیر منقسم ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومتیں قائم ہونے سے یہاں کی علمی زبان کے طور پر اپنا نقش جمائے رکھا۔

اس ضمن میں حضرت سید علی ہجویری کی فارسی تصنیف ''کشف المحجوب'' اور لاہور کے پہلے صاحبِ دیوان فارسی شاعر مسعود سعد سلمان لاہوری کا کلیات غیر منقسم ہندوستان کے ابتدائی سرمایۂ علم و ادب کے طور پر تاریخِ ادبِ اُردو کے نہایت اہم حوالے ہیں۔ محمود غزنوی اور مسعود غزنوی کو اہلِ علم سے خاص لگاؤ تھا اور ان کے دربار سے کئی اہلِ علم و ادب وابستہ تھے۔[1]

ظہیر الدین بابر کی آمد اور مغلیہ خاندان کے پُر عظمت دورِ حکومت میں فارسی گو شعرا، مؤرخین اور بے شمار اہلِ ادب کا سلسلہ در سلسلہ تذکرہ ملتا ہے۔ ظہیر الدین بابر خود شاعر تھا اور شاعروں کا قدردان بھی۔ تزکِ بابری اس کی خود نوشت سوانح ہے جو سادگیِ بیان، صداقت آمیزی اور واقعاتی تسلسل کے لحاظ سے مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ کئی زبانوں خصوصاً انگریزی اور اُردو میں بھی اس کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح بابر کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کی تالیف ''ہمایوں نامہ''، نور الدین جہانگیر کی ''تزک جہاں گیری'' اس علمی روایت کی مظہر ہیں، تاہم ہمیں مغلیہ عہد کے جن اہلِ علم و ادب کا تذکرہ تسلسل کے ساتھ ملتا ہے، ان میں شاعر بھی ہیں اور مؤرخ بھی، داستاں نگار بھی ہیں اور وقائع نگار بھی۔ مذہبی کتابوں کے مؤلفین بھی ہیں اور پند و نصائح پر مشتمل تالیفات کا سلسلہ بھی نظر آتا ہے۔ مغلوں کی آمد سے قبل اور دورِ مغلیہ میں بھی ہندی ادب اور اس کی اخلاقیات پر مشتمل کتابیں بھی موجود تھیں۔ ہندومت میں اخلاقیات کی تعلیمات پر مشتمل کتابوں کے اثرات یہاں کے اہلِ علم پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس طرح مذہبِ اسلام کی تعلیمات جس کا بنیادی فلسفہ اخلاقیات پر استوار ہوتا ہے، ایسی تعلیمات کو پسندیدہ نظر سے دیکھتا ہے اور اسلام کی مطابقت سے اس کے اثرات کو بھی قبول کرتا ہے۔ مذہبی رواداری کی تعلیم بھی فلسفۂ اخلاقیات سے جنم لیتی ہے اور اسلام اور اہلِ اسلام نے اس حوالے سے خصوصی کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان میں

خاص طور پر جلال الدین اکبر کے عہد میں مسیحیت کو جو فروغ حاصل ہوا، اُس میں اہلِ اسلام کی مذہبی رواداری کو بھی خصوصی دخل ہے چناں چہ ہندوستان میں مسلمانوں کے شاہانہ اور سیاسی غلبے کی پائیدار بنیادیں اسی مذہبی رواداری نے قائم کی تھیں۔ اس سلسلے میں اکبری عہد میں مسلمانوں کے علوم و فنون نے اہلِ ہند پر جو اثرات مرتب کیے تھے، وہ آج تک قابلِ ستایش ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے جب مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو گیا تو غیر متعصب ہندوئوں کو بھی اتنا ہی صدمہ ہوا جتنا مسلمانوں کو تھا، اس لیے کہ وہ مغلیہ سلطنت کو اپنی ہی حکومت تصور کرتے تھے، اور یہ احساس انھیں مغلوں کی مذہبی رواداری خصوصاً جلال الدین اکبر کے عہدِ حکومت نے عطا کیا تھا۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں یہ جذبہ کار فرما تھا کہ غیر منقسم ہندوستان صرف ہندوئوں ہی کا نہیں، بلکہ مسلمانوں کا بھی گھر ہے، چناں چہ آزادی کی یہ جنگ انھی بنیادوں پر لڑی گئی۔

مذہبی رواداری کے اس شعور کے پس منظر میں جہاں صوفیا و مشائخ کی کاوشیں اور سلطنتِ مغلیہ کی حکمتِ عملی شامل رہی ہے، وہاں اہلِ علم کا کردار بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اکبر کے دور میں ملک الشعرا فیضی اور ابوالفضل وغیرہ کی علمی کاوشیں اس حوالے سے فارسی شعر و ادب کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔ یوں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) بلکہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تک ہمیں فارسی کے ان گنت شعرا، ادبا، مؤرخین اور مصنفینِ نظم و نثر کی گراں بہا تالیفات و تصنیفات نظر آتی ہیں۔ ان میں ہندوئوں کی فارسی تصانیف بھی ہیں اور مسلمانوں کی بھی۔ یہ سارا سرمایۂ علم و ادب برِ عظیم کی تاریخ میں گراں قدر حیثیت رکھتا ہے۔

اُردو زبان و ادب کے ابتدائی سفر کے ضمن میں جب ہم جنوبی ہندوستان میں دکنی ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُردُو کی ابتدائی نشوونما میں مذہبِ اسلام کے صوفیائے کرام نے خاص کردار ادا کیا ہے۔ مقامی لب و لہجہ پر مشتمل تخلیق ہونے والا ادب اس دور میں زیادہ تر مذہبی نوعیت کا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مذہب کے فروغ اور تبلیغ میں وہی زبان کارآمد رہی ہے جو متعلقہ خطے کی زبان ہو، مگر اہلِ علم کی ایک زبان وہ ہے، جسے ہم علمی زبان قرار دیتے ہیں اور اس دور کی علمی زبان فارسی زبان ہی تھی۔ فارسی کا عمل دخل تو ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت بل کہ یہاں تک کہ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد تک، خاص طور پر قیامِ پاکستان تک اپنے پورے رسوخ کے ساتھ موجود تھا۔ اگر فورٹ ولیم کالج کے قیام میں گل کرسٹ اور اُردُو زبان و ادب سے نمایاں دل چسپی رکھنے والے گارسیں دتاسی اور چند ایک دوسرے مسیحی مستشرقین کی خدمات اپنے علمی تسلسل کے ساتھ سامنے نہ آتیں تو یہ کہنا کوئی زیادہ مشکل نہیں کہ اُردُو کا وجود یا اس کی ترقی کو مزید کئی سال درکار ہوتے اور فارسی ہی بنیادی

زبان کے طور پر ہندوستان کے مختلف علاقوں کی علمی زبان رہتی۔ تاہم فارسی زبان کا نمایاں اثر ہمیں دکن کی مقامی زبان پر نظر آتا ہے اور وہ زبان جو دکنی زبان اور فارسی زبان کے الفاظ کا ملغوبہ دکھائی دیتا ہے۔ دکنی زبان کے خدوخال جن سیاسی اثرات کے تحت مرتب ہوئے، اُن میں علاء الدین خلجی (۱۲۹۷ء) کی فتحِ گجرات ایک خاص واقعہ ہے۔ علاء الدین خلجی کا مرکزی دارالحکومت دہلی (شمالی ہندوستان) تھا۔ فتوحات کے شوق میں نہ صرف اُس نے گجرات بلکہ پورے دکن اور مالوہ کو فتح کر لیا اور وہاں کے انتظام و انصرام کے لیے اور مال گزاری وصول کرنے کے لیے جن ترک افسروں کو بھیجا اُن کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ بہت جلد بہت سے ترک خاندان بھی وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''شمالی ہند سے آنے والے یہ حکمران خاندان جب گجرات سے دکن تک کے سارے علاقوں میں اپنے متوسلین کے ساتھ آباد ہوئے ہوں گے تو تہذیبی و لسانی سطح پر کیا کیا تبدیلیاں آئی ہوں گی؟ یہ لوگ ترک نژاد ضرور تھے، لیکن خود ان کو شمالی ہند میں شمال مغرب سے لے کر دہلی تک آباد ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ یہ لوگ شمالی ہند سے اپنے ساتھ وہ زبان لے کر آئے تھے، جو بازار باٹ میں بولی جاتی تھی اور جس کے ذریعے یہ معاملاتِ زندگی طے کرتے تھے۔ امیرانِ صدہ کے اپنے اپنے حلقوں کی زبان اُس زبان سے مختلف تھی جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ نہ اُن علاقوں کی زبان بول سکتے تھے اور نہ ترکی فارسی کے ذریعے معاشرتی سطح پر لین دین کر سکتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبان میں یہاں کی مقامی زبانوں اور فارسی، عربی اور ترکی الفاظ شامل کر کے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا اور اس طرح اس زبان کو سیاسی و معاشرتی تقاضوں کے تحت نئے ماحول میں قابلِ قبول بنا دیا۔''(۲)

اس امر کی وضاحت میں مزید آگے چل کر جالبی صاحب لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔ شمال سے لے کر دکن و گجرات تک اس زبان کے پھلنے پھولنے اور بڑھنے پھیلنے کے لیے ایسی سازگار فضا پیدا کر دی کہ یہ زبان ان سارے علاقوں کی مشترک زبان بن کر تیزی سے ترقی کے زینے طے کرنے لگی۔ صوفیائے کرام نے اس زبان کو تبلیغِ دین و اخلاق کے لیے استعمال کیا۔ قوالی، موسیقی، شاعری اور درسِ اخلاق کی یہی زبان

ٹھہری۔ عام معاملاتِ زندگی اور دربار سرکار کے مختلف طبقوں کے درمیان یہی زبان وسیلۂ اظہار بنی۔ اُردُو زبان کا اب تک یہی مزاج قائم ہے اور برِ عظیم پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں یہ زبان آج بھی یہی کام انجام دے رہی ہے۔" (۳)

یہی وجہ ہے کہ اُردُو نثر میں ملاوجہی کی "سب رس" کی زبان اور اُردُو نظم (مثنوی) میں غواصی دکنی کی مثنوی "کدم رائو پدم رائو" میں ترکی، فارسی، عربی، ہندی اور مقامی زبان کے مشترک الفاظ اور لب و لہجہ موجود ہے۔ بالتحقیق اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اُردُو زبان کا اصل مولد شمالی ہندوستان بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ جہاں کے ترک اہلِ زبان مستقل طور پر دکن میں آباد ہوئے اور اُن کی زبان کے امتزاج نے مقامی زبان پر اثر ڈالا اور ایک نئی زبان دکنی اُردُو کی شکل میں وجود میں آئی، چناں چہ یہی وجہ ہے کہ کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام (۱۸۰۱ء) عمل میں آیا تو فارسی زبان کی کتابوں کے تراجم کی زبان میں شمالی ہندوستان کی زبان کے اثرات نمایاں طور پر سامنے آئے۔ میرا من کا قصہ "باغ و بہار" کی زبان میں جو فصاحت اور روانی ہے اس میں شمالی ہندوستان کی زبان کا لب و لہجہ صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح دیگر بہت سی کتابیں جیسے حیدر بخش حیدری کی "آرایشِ محفل" وغیرہ کی زبان میں بھی ہمیں اُردُو کا وہ ابتدائی لہجہ ملتا ہے جو بعد میں دہلی و لکھنؤ کی رنگینیِ بیان میں ڈھلا اور رفتہ رفتہ غالب کے عہد تک آتے آتے بے تکلف اندازِ اظہار کا نمونہ بنا۔

ہندوستان میں مسیحی اقتدار۔۔۔ سیاسی، مذہبی اور سماجی پس منظر

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی جنوبی ہندوستان کی جہاں سیاسی و سماجی فضا بدلنے میں اہم ہے وہیں علمی و ادبی پیش رفت کے لیے بھی ابتدائی برگ و بار لے کر آئی۔ ابتدائی طور پر مغرب سے بحری جہازوں کے ذریعے سواحلِ ہند پر اہلِ یورپ کا داخلہ تجارت کی غرض سے تھا۔ پرچگیز، فرانسیسی اور آخر میں انگریزوں کی آمد نے اپنی تجارت کا آغاز کیا تو یہاں کی بیش بہا اشیائے صرف ان کی آنکھوں کو خیرہ کرتی رہیں۔ چناں چہ وہ یہاں سے قیمتی سامان سستے داموں میں خرید کر یورپ کی منڈیوں میں بیچتے رہے۔ پرچگیزوں نے کچھ ہی عرصہ میں اس تجارت کے نفع بخش عمل کے بعد فوجی طاقت کا بھی استعمال کیا اور ملیبار کے راجہ کو شکست سے دو چار کر کے باقاعدہ قبضہ جما لیا۔ ہندوستان میں سب سے پہلا فوجی قلعہ پرچگیزوں نے تعمیر کیا۔ اس زمانے میں مسلمان تاجر بھی تجارت کی غرض سے ہندوستان کا بحری سفر کرتے ہوئے ملیبار اور دوسرے ساحلی علاقوں تک پہنچتے تھے، بعض مستقل طور پر ان علاقوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ پرچگیزوں نے ۱۵۰۵ء المیڈا (Prancisco

(De Almeidal کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجا۔ اس نے سواحلِ ملیبار کے علاقہ کو چین میں سکونت اختیار کر کے مسلمانوں کو سیاہ مرچ کی تجارت سے روک دیا۔ اس پر مسلمانوں اور ہندو راجہ کو بھی ناگوار گزرا اور انھوں نے شاہانِ گجرات و بیجاپور یہاں تک کہ سلطانِ مصر سے بھی امداد طلب کی۔ تاہم کوئی خاص کامیابی نہ ملی پرچگیزوں نے وہاں کے مختلف علاقوں میں خاصی تباہی مچائی۔ پرچگیزوں کی قوت سواحلِ ہند پر بڑھتی رہی۔ پرچگیز جس علاقے میں بھی جاتے لوٹ مار کرتے۔ کئی سال بعد ہالینڈ (ڈچ) کے باشندوں (ولندیزوں) نے اپنی بحری قوت مہیا کر کے ہندوستان کی جانب پیش قدمی کی اور پرچگیزوں کا جنوبی ہندوستان پر عمل دخل کم ہونے لگا۔ پچاس سال کے اندر اندر ان کے تمام مقبوضات ان کے قبضے سے نکل گئے۔ المختصر ۱۶۴۰ء میں فرانسیسی سیاح ''گوا'' میں وارد ہوا اور اس کے بعد فرانسیسیوں کو عروج حاصل ہوا۔ (۴)

اس ضمن میں پروفیسر محمد سلیم لکھتے ہیں:

> ''فرانسیسی کمپنی کا دائرۂ کار جنوبی ہند تھا۔ وہیں ساحلی شہروں میں وہ تجارت کرتی تھی۔ پانڈی چری ان کا دارالحکومت تھا۔ ۱۷۰۲ء۔ ۱۷۴۲ء تک ان کی تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ پرتگالیوں اور ڈچوں پر فرانسیسی فوقیت لے گئے۔ الیگینڈر ڈوما Alexandre Dumas کمپنی کا سربراہ بڑا منتظم شخص تھا۔ اس کی جگہ ڈوپلے (Duplex) ناظم اعلیٰ مقرر ہو کر آیا۔ اس کے زمانہ میں فرانسیسی کمپنی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ تجارت کے ساتھ سیاست میں بھی اس نے اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ نظام حیدر آباد، نواب آرکاٹ اور حیدر علی والیِ میسور کے درباروں میں ڈوپلے اثرات نمایاں تھے، لیکن فرانس کی مرکزی حکومت ڈوپلے کے عزائم کا ساتھ نہ دے سکی، اس نے ڈوپلے کو واپس بلا لیا۔ اس کا بنایا ہوا سارا کھیل ختم ہو گیا۔ مرکزی پشت پناہی سے محروم فرانسیسی کمپنی بتدریج زوال پذیر ہوتی چلی گئی۔ ۱۷۶۰ء کے بعد اس کا اثر ختم ہو گیا۔''(۵)

فرانسیسیوں کی قوت ختم ہو گئی تو انگریز جو تجارت کی غرض سے پہلے ہی سے یہاں موجود تھے، انھیں اپنے قدم جمانے آسان ہو گئے۔ اُن کی تجارت بھی اجارہ داری کے جابرانہ اصول کے ماتحت تھی۔ پروفیسر سید محمد سلیم اس کے تاریخی تناظر میں رقم طراز ہیں:

"مغل شہنشاہ فرخ سیر (۱۷۱۲ء۔ ۱۷۱۸ء) سے اس نے رعایت کا ایک فرمان حاصل کر لیا تھا۔ پھر اس کا جا و بے جا استعمال کیا اور خوب دولت سمیٹی۔ ۱۶۹۵ء میں بنگال کے نواب سے کلکتہ میں قلعہ بنانے کی اجازت حاصل کی اور قلعہ فورت ولیم تعمیر کیا۔ اس طرح سیاسی قوت فراہم کی۔ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ نواب بنگال کو شکست دے کر عملاً بنگال میں حکومت قائم کر لی۔ پ ُر نے مزید جوڑ توڑ سے ۱۷۶۵ء میں بکسر کی جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مغل شہنشاہ سے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی (اختیارات) پر قبضہ کر لیا اور پھر بتدریج سارے ہندوستان پر قبضہ جما لیا۔" (۶)

دیکھا جائے تو ایک لحاظ سے سارے ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ سقوطِ میسور (۱۷۹۹ء) ہی میں عمل میں آ چکا تھا۔ اس سے قبل انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی فوجی قوت کچھ ایسی شدت سے مہیا کرنی شروع کر دی تھی کہ جنوبی ہند میں چھوٹی چھوٹی مختلف فتوحات کے بعد وہاں کی سب سے بڑی اور طاقت ور سلطنت، سلطنتِ میسور کو ۱۷۹۹ء میں شکست دے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے جنرل ہارس نے یہ اعلان کر دیا کہ "آج ہندوستان ہمارا ہے۔"(۷) اور فی الحقیقت ۵۸ سال بعد ۱۸۵۷ء میں پورے ہندوستان پر اُن کا قبضہ ہو گیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ ہندوستان کی راجدھانی براہِ راست ملکہ برطانیہ کے زیرِ عمل آ گئی۔

ہندوستان میں مسیحیت کا فروغ

ہندوستان بالخصوص ابتدا میں جنوبی ہند میں مغربی اقوام کی فوجی پیش قدمی اور سیاسی یورش نے مذہبی پرچار میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ مسیحیت کی بنیادی تعلیمات کے فروغ کے لیے ان کی عملی کاوشیں ساتھ ساتھ جاری رہیں۔ "جس زمانے میں پرتگال کے لوگ ہندوستان میں آئے ان میں یسوعی (Jesuit) فرقہ کے لوگ زیادہ سرگرمِ عمل تھے۔ تحریکِ اصلاحِ دین (Reformation) کے انسداد کے لیے پوپ نے ۱۵۴۰ء میں ردِ تحریک اصلاح (Anti Reformation Movement) جاری کی تھی۔ اس کی سرگرم شاخ یسوعی فرقہ تھا۔ اس فرقہ کے مبلغین یورپ اور ایشیا سب جگہ پھیل گئے تھے۔" (۸)

عیسائی مشنری کے بعض افراد (پادری) اکبری عہد میں بادشاہ کی خدمت میں پہنچے۔ اکبر نے ان کی خاطر خواہ تواضع کی۔ اکبر کو چوں کہ اسلام کے علاوہ مذاہبِ دیگر سے بھی دل چسپی تھی، اس نے ان کے لیے لاہور میں فرنگی اسکول قائم کرنے کی اجازت دے دی جس میں امرا اور نوابوں کے بچوں کو داخل کرایا گیا۔ ان طلبا کو یورپی

زبانیں پڑھائی جاتی تھیں۔ پادریوں کو چوں کہ مسیحیت کی اشاعت مقصود تھی، اس لیے مطلوبہ تعلیم کی جانب انھوں نے زیادہ توجہ نہ دی اور یوں مسیحیت کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔

اس ضمن شیخ اکرام لکھتے ہیں:

> ''گوا سے اکبر کے دربار میں تین مرتبہ پادری بھیجے گئے۔ تیسرا مشن۔۔۔ جو ۱۵۹۷ء میں لاہور پہنچا اور اکبر کی وفات تک ملک میں موجود تھا۔ دوسرا مشن ۱۵۹۱ء میں بھیجا گیا، لیکن اگلے سال واپس بلا لیا گیا۔ اس مشن کے ارکان کو بعض شاہزادوں اور امرا کے بیٹوں کو پرتگیزی زبان (بقول ابوالفضل لاطینی زبان) سکھانے پر لگایا گیا۔ اس مشن کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے اور معاصرانہ رپورٹ کو، جو لاطینی زبان میں ہے، درج کرنے کے بعد مسٹر پین لکھتے ہیں:
>
> اس رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ خواہ پادریوں کے متعلق اکبر کا اپنا طرزِ عمل کیا ہو، اس کے اُمرا یقیناً ان کے مخالف تھے۔ بہت ممکن ہے کہ پادریوں نے اس خوش اخلاقی اور تدبر کا ثبوت نہیں دیا جس کی صورتِ حالات متقاضی تھی اور امرا کی مخالفت اس حد تک بڑھی کہ مشن کو جاری رکھنا بے سود ہو گیا۔'' (۹)

بہر حال اس ناکامی کے باوجود مسیحی پادریوں کی یہ ابتدائی کوششیں تھیں، جن کو وہ بہت جلد ہندوستان میں بروئے کار لائے اور کہیں سیاسی اور کہیں مذہبی تبلیغ کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد میں انھوں نے جہانگیر سے خصوصی اجازت حاصل کر کے ایک قطعۂ اراضی حاصل کیا بلکہ خود جہانگیر نے یہ اراضی انھیں عطا کی اور ۱۶۰۹ء میں آگرہ میں ایک گرجا اور چند مکانات تعمیر کیے۔ فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے:

> ''آگرہ میں ایک گرجا بھی ہے جس کو جیسویٹ (Jesuit) فرقہ کے لوگوں نے بنایا تھا اور ایک مکان ہے جس کو وہ کالج کہتے ہیں جس میں پچیس تیس گھرانوں کے عیسائی مسیحی بچوں کو عقاید مذہبی کی تعلیم دی جاتی ہے مگر مجھے نہیں معلوم کہ یہ مسیحی خاندان یہاں کس طرح جمع ہو گئے ہیں۔ شاید جیسویٹ پادریوں کے فیاضانہ اور مہربانہ سلوک نے ان کو یہاں سکونت اختیار کر لینے پر مائل کیا ہے۔'' (۱۰)

اکبری عہد میں پادریوں کی ناکامی کے بعد جہانگیر کے عہد میں انھیں مسیحی مذہب کی تبلیغ میں آسانی کا امکان نظر آنے لگا تھا۔ ڈاکٹر برنیر نے اس پر یوں روشنی ڈالی ہے:

> ''جہانگیر کے زمانہ میں ان لوگوں کو امید تھی کہ ہمارا مذہب کچھ نہ کچھ یہاں پھیل جائے گا کیوں کہ جہانگیر حقیقت میں قرآن کے مسائل کو نہایت ناپسند کرتا تھا اور ہمارے مذہب کے مسئلے اس کو ایسے بھاتے تھے کہ ان پر اپنا تعجب ظاہر کرتا تھا، چناں چہ اس نے اپنے دو۔۔۔ بھانجوں یا بھتیجوں اور مرزا ذوالکرنین (ذوالقرنین) کو جس کا ختنہ بھی ہو چکا تھا اور شاہی محل سراہی میں پرورش پائی تھی، عیسائی ہو جانے کی اجازت دے تھی اور بہانہ یہ کیا تھا کہ اس کے ماں باپ عیسائی تھے کیوں کہ اس کی ماں جو ایک دولت مند ارمنی کی بیوی تھی، جہانگیر کی خواہش کے موافق محل میں داخل ہو گئی تھی، اور یہ لوگ یہاں تک کہتے تھے کہ جہانگیر کے مسیحی ہو جانے کا قصد اس درجہ کو پہنچ گیا تھا کہ اس نے تمام دربار کو فرنگستانی لباس پہنانے کا دلیرانہ ارادہ کیا اور ایک دن خلوت میں یہ لباس پہن کر اپنے ایک بڑے امیر کو بلایا اور اس کی اس باب میں رائے دریافت کی مگر اس نے ایسا اندیشہ ناک جواب دیا کہ جہانگیر نے ڈر کر یہ ارادہ چھوڑ دیا اور اس تمام قصہ کو ہنسی کے پیرایہ میں اڑا دیا۔'' (۱۱)

اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغلیہ عہد میں بھی عیسائی مشنری کوششیں کس درجہ پر تھیں اور کس حد تک اس مذہب کی اشاعت میں پھیلاؤ آ چکا تھا۔ مغلیہ عہد میں مسیحی پادریوں کی مسیحیت کی تبلیغ کے لیے یہ انفرادی کاوشیں تھیں جن کا ضمناً ذکر محض اس لیے کیا گیا کہ اندازہ ہو سکے کہ ہندوستان میں مسیحیت کی تبلیغ کے لیے صرف سیاسی اور لشکری جبریت ہی نے مسیحیت کی اشاعت نہیں کی بلکہ مشنری جذبہ و احترام کے ساتھ بھی انھوں نے اپنا مذہبی فریضہ ادا کیا۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جنوبی ہندوستان میں فوجی طاقت سے حاصل ہونے والے اقتدار نے کہیں تو خود مغربی اقوام اور کہیں اُن کی فتوحات کے نتیجے میں ہندوستان میں مسیحیت کو فروغ ملا۔ مختلف علاقوں میں مسیحی مدرسے اور گرجوں کی تعمیر بھی مذہب کی اشاعت کا باعث بنی۔ ہندوستان کا مصائب و مسائل کا مارا ہوا، مفلوک الحال اور نچلی سطح پر معاشی و سماجی جبریت میں پسا ہوا طبقہ خاص طور پر مسیحی مذہب سے متاثر ہوا اور انھیں ہندووانہ نظامِ جبریت سے نکلنے کا دل کش راستہ مسیحیت کی اخلاقی تعلیمات میں نظر آنے لگا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ

آزادی جسے برٹش حکمرانوں نے بغاوت کا نام دیا، مسلمانوں اور ہندوئوں کے علاوہ بہت سے مقامی مسیحی بھی انگریزی فوج میں پیش پیش تھے۔ شمالی ہندوستان پر انگریزی قبضے کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے برطانوی حکومت کو اقتدار منتقل ہو گیا تو برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک سے عیسائی مشنریوں کا سلسلہ بھی جاری ہو گیا اور مسیحی پادریوں کی آمد نے ہندوستان میں مسیحیت کو پھیلانے میں وسیع تر منصوبے کے ساتھ کام شروع کر دیا اور انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔

فورٹ ولیم کالج اور اُردُو زبان کو عروج

ٹیپو سلطان سلطنتِ میسور کا اولوالعزم حکمران تھا جس نے ابتدا میں انگریزوں کو پے در پے شکستوں سے دوچار کیا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کی چوتھی جنگ میں جن وجود کی بنا پر انگریزوں کو کامیابی ملی، ان میں سب سے بڑا سبب اُن غداروں کا وجود تھا جو خود حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں کی کامیابی صرف ایسٹ انڈیا کمپنی کی کامیابی نہیں تھی بلکہ بعد میں تاریخی حقائق سے ثابت ہوا کہ پوری سلطنتِ برطانیہ کی کامیابی تھی۔ کلکتہ میں اس فتح کے دو سال بعد فورٹ ولیم کالج کا قیام اسی کامیابی کا جشن تھا۔ اس کالج میں ابتدائی کام دورانِ جنگ تباہ کاری کے بعد ٹیپو سلطان کے بچے کھچے کتب خانے کی منتقلی تھی ورنہ سیکڑوں کتابیں تلف ہو گئی تھیں، اس کے باوجود لاتعداد کتابیں فورٹ ولیم کالج پہنچیں اور محفوظ ہو گئیں۔ "سلطان کی علم دوستی کا اس سے پتا چلتا ہے جمیع الامور کے نام سے جو یونیورسٹی قائم کی تھی، اس میں مذہب کی تعلیم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔"[۱۲] ٹیپو سلطان کی علمی و ادبی خدمات ایک الگ دفتر ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے تاہم یہاں یہ ذکر تحصیلِ لاحاصل نہ ہو گا کہ اُس کے حکم سے بعض کتابیں تصنیف ہوئیں۔ "فتح نامہ ٹیپو سلطان" (تصنیف: سین علی عزت) وغیرہ (جسے اب مرتب کر کے ڈاکٹر معین الدین عقیل نے شائع کروا دیا ہے)، "مفرح القلوب"[۱۳] (تصفیف: حسین علی عزت) اور "فتح المجاہدین"[۱۴] (تصنیف: میر زین العابدین شوستری)[۱۵] اُردُو کا پہلا اخبار محمد حسین آزاد کے "دہلی اُردُو اخبار" کو سمجھا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اُردُو کا پہلا اخبار بھی ٹیپو سلطان نے جاری کیا۔ اس کے لیے ایک پریس لگایا گیا اور یہ اخبار "فوجی اخبار"[۱۶] کے نام سے نکلا۔

جشن فتح کے دو سال بعد کلکتہ میں کالج کا قیام نہ صرف اُردُو زبان کے ارتقائی سفر میں معاون بلکہ ایک لحاظ سے اُردُو کی علمی و ادبی ترقی کا ضامن بھی ثابت ہوا۔ فاتحین کی سیاسی مصلحتیں کچھ بھی ہوں، جان گل کرسٹ جیسے صاحبِ فکر، اور علم پرور شخصیت کی اُردُو خدمات کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فورٹ ولیم کالج اور اُردُو ادب

کے لیے اُن کی مزید خدمات رہتیں، حکمرانوں کی مصلحت اندیشی اور سیاسی پالیسیوں کی وجہ سے گل کرسٹ کو کالج سے الگ ہونا پڑا اور اسے ایک سانحہ ہی قرار دیا جاسکتا ہے، مگر اس کالج سے اُردو زبان میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں وہ ہماری تاریخ ادب کا ایک نمایاں ترین حصہ ہیں۔ اُردو زبان کی نثر پر اس حوالے سے گل کرسٹ کے زیرِ نگرانی کام کو ایک اہم کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''ان کتابوں کی تالیفی سرگرمیوں اور اشاعت سے، شاعری کے ساتھ، اب نثر نے بھی اہمیت اختیار کر لی۔ بول چال کی زبان سے قریب رہتے ہوئے نثر کا اسلوبِ بیان نیا رجحان بن کر اُبھرنے لگا اور فارسی و عربی کے زیرِ اثر رنگین عبارت کے موجود پسندیدہ اسلوب کا رواج کم ہونے لگا۔ اس سے اُردو نثر کو جدید دور میں داخل ہونے کا راستہ مل گیا۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ بول چال کی زبان میں نثر لکھنے کے نمونے اٹھارھویں صدی عیسوی میں بھی موجود تھے۔۔۔ لیکن اس اسلوبِ بیان نے ایک رجحان، ایک تحریک کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ سادہ و سلیس اور بول چال کی زبان میں نثر کالج کی نصابی ضرورت تھی اور اس رجحان کی بنیاد استاد گل کرسٹ نے رکھی تھی۔'' (۱۷)

مسیحی مستشرقین کی اُردو کے لیے علمی و ادبی خدمات

اُردو کے لیے مستشرقین کی علمی خدمات کا دائرہ ابتدائی طور پر باہمی میل جول کی ضرورت قرار دیا جاسکتا ہے جو آہستہ آہستہ اس زبان سے علمی و ادبی دل چسپی کا باعث بنتا چلا گیا۔ تجارتی اور پھر سیاسی ضرورت کے تحت ہندوستانی زبانوں کو سمجھنے کے لیے انھوں نے وہ علمی کام سرانجام دیا جو اُن سے پہلے مقامی لحاظ سے کسی نے نہیں کیا تھا۔ قواعدِ زبان و بیان پر انشا اللہ خاں انشا کی ''دریائے لطافت'' ایک ہندوستانی قلم سے نکلی ہوئی پہلی کتاب ہے، مگر اہلِ یورپ نے اس سے قبل زبان و لغت پر جو کتابیں تحریر کیں، انھیں معیار سے قطعِ نظر زمانی اعتبار سے ''دریائے لطافت'' پر فوقیت حاصل ہے۔ دراصل پرچگیزوں، فرانسیسیوں، ولندیزوں (ڈچ) اور بعد ازاں انگریزوں کی آمد نے جنوبی ہندوستان کے جن علاقوں میں اپنی یورپین آبادیاں قائم کی تھیں، وہاں کے مقامی لوگوں کی زبانوں کے اثرات جہاں اُن کی بول چال کا حصہ بنے، وہیں ان یورپین زبانوں کے اثرات بھی مقامی لب و لہجہ میں شامل ہوئے۔ علاوہ ازیں کاروبار، لین دین اور بات چیت میں ایک دوسرے کو اپنا مافی الضمیر سمجھانے کے لیے مقامی زبان سے کچھ نہ کچھ آگاہی ضروری تھی اور یوں مقامی لوگوں کو بھی ان کی زبان کے بعض الفاظ سے آشنائی ملی۔ مقامی طور پر اگرچہ

اس وقت سواحلی علاقوں میں زیادہ تر مشترک زبان کے طور پر بنگالی کا عمل دخل تھا۔ پھر بنگالی، مرہٹی اور دیگر ہندوستانی زبانوں نے شروع میں پرچگالی اثرات قبول کیے۔ اس طرح دوسری مغربی زبانوں کے الفاظ بھی عام بول چال میں شامل ہو گئے۔ یہ عام بول چال علمی زبان میں ڈھل کر اُردُو کی وہ ابتدائی شکل ہے جو دوسری جانب ترقی پذیر شکل میں دکنی ادب کا سرنامۂ امتیاز ہے۔

اس ضمن میں عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

> ''اٹھارھویں صدی کا آفتاب جب طلوع ہوا تو دکنی زبان اپنے عروج کی منزلیں (طے) کرنے کے بعد 'ہندوستانی زبان' (اُردُو) زبان و ادب کے لباس میں جلوہ گر ہونے کے لیے بے تاب تھی۔ ولی (متوفیٰ ۱۷۰۷ء) اور ان کے معاصرین ہندوستانی شاعری کے آسمان پر نمودار ہو چکے تھے۔ اسی صدی کے پہلے ادھواڑے میں ہندوستانی نثر کی داغ بیل پڑ چکی تھی، جس کا اولین نمونہ ہم کو فضلی کی 'کربل کتھا' میں نظر آتا ہے۔ فضلی کے بیان کے مطابق ۱۱۴۵ھ (۳۳۔۱۷۳۲ء) میں ''مسودہ اس نسخۂ معتبر کہ کا تصنیف ہو چکا تھا اور ۱۱۶۱ھ (۴۸۔۱۷۴۷ء) میں مصنف نے اس کی 'نظر ثانی کر کے بہ کمیّت و کیفیتِ مضامین و بہ ہندی اصطلاحات و استعاراتِ رنگین' اختتام کو پہنچایا۔'' (۱۸)

اِدھر اہلِ یورپ کو اپنے ہم زبانوں کے لیے مقامی زبان کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ایسی کتابوں کی ضرورت تھی، جنھیں پڑھ کر وہ آسانی سے اس زبان میں گفتگو کر سکتے۔ سترھویں صدی کے اُس زمانے میں بعض یورپین سیاحوں نے بھی اپنے سفرناموں اور خطوط میں اُردُو زبان کا ذکر کر رکھا ہے۔(۱۹) اس حوالے سے حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

> ''کپتان ہملٹن اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہندوستان کے ساحلوں پر اہلِ پرتگال کی زبان کا اس قدر اثر موجود ہے کہ اہلِ یورپ باہمی گفتگو اور اہلِ ہند سے میل جول کے لیے یہ زبان حاصل کرتے تھے۔ لاکیر اپنی کتاب (اشاعت ۱۷۱۱ء) میں ذکر کرتا ہے کہ اہلِ پرتگال کو یہ فخر حاصل ہے کہ ان کی زبان نے سواحلِ ہند پر ایک مشترک زبان پیدا کر دی ہے جو تمام اہلِ یورپ کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔'' (۲۰)

گویا بہت جلد اس زبان نے اہلِ یورپ کو اپنی گفتگو اور دل چسپی کا محور بنا لیا تھا۔ بقول حامد حسن قادری:

"پرتگال والے سب سے پہلے آئے۔ تجارت سے ترقی کر کے حکومت میں حصہ لیا، ساحلوں پر قبضہ جمایا، تجارتی کوٹھیاں بنائیں، جائیدادیں خریدیں، اپنا مذہب پھیلایا، ہندوستانیوں کو عیسائی بنایا۔ ان سب مشاغل اور مصروفیتوں کے لیے اہلِ ہند سے میل جول کی ضرورت تھی، چناں چہ اہلِ پرتگال نے سواحلِ ہند کی زبانیں سیکھیں اور اپنی زبان سکھائی۔ (۲۱)

زبان سیکھنے کے اس عمل نے اہلِ یورپ کے لسانی ماہرین کو کتابیں لکھنے کی جانب متوجہ کیا۔ سب سے پہلے اس سلسلے میں ہمیں جان جوشوا کیٹیلر (John Joshua Keterlear) کی ہندوستانی صرف و نحو پر ایک کتاب کا سراغ ملتا ہے جو ڈیوڈ مل (David Mill) نے ۱۷۴۳ء میں شائع کی۔ یہ شخص ولندیزیوں (ڈچ) کی جانب سے مغل بادشاہ شاہ عالم (۱۷۰۸ء تا ۱۷۱۲ء) اور جہاندار شاہ (۱۷۱۳ء) کے دربار میں بطور سفیر بھیجا گیا تھا۔ (۲۲)

بقول مولوی محمد سردار علی (مؤلف: "یورپین شعرائے اُردُو") یہ کتاب لاطینی زبان میں لکھی گئی اور حوالے کے طور پر جو ہندوستانی الفاظ اور عبارتیں اس میں درج ہیں، وہ رومن رسم الخط میں ہیں۔ ۲۳

اس حوالے سے عطش درانی لکھتے ہیں:

"اُردُو کے پہلے قواعد نویس جان جوشوا کیٹیلر کے بارے میں محمد سردار علی نے لکھا کہ اس نے لاطینی میں اُردُو کا لغت بھی لکھا تھا، اس کی بابت تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ جرمنی پادری بنجمن شلزے نے ۱۷۷۸ء میں اُردُو قواعد کی جو کتاب 'گریمیٹیکا انڈوستانا' لکھی، اس میں ہندوستانی لغات بھی دیے گئے تھے۔" (۲۴)

اس کتاب میں حضرت عیسیٰ کی مشہور دعا کے اُردُو ترجمے کا اندراج بھی ملتا ہے، جسے بطور نمونہ حامد حسن قادری کی "تاریخ داستانِ اُردُو" سے یہاں درج کیا جاتا ہے:

"ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے، پاک ہوئے تیرے نام، آوے ہم کوں ملک تیرا، ہوئے راج تیرا، جوں آسمان تو جمین (زمین) میں روٹی ہمارے نہ تھی۔ ہم کو آس دے اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کوں، جو معاف کرتے اپرے (اپنے) قرض داروں کو، نہ ڈال ہم کوں اس وسوسوں میں بلکہ ہم کوں گھس کر اس برائی سے، تیری پسجئی سواری عالمگیری حمایت میں، آمین۔ (۲۵)

جوشوا کیٹیلر (John Joshua Ketelear) نے ۱۷۴۸ء میں بائبل کا اُردو ترجمہ بھی کیا تھا۔ بائبل کے ترجمے کے حوالے سے عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

"بقول گریرسن (Grierson) کسی ہندوستانی زبان میں ایک یورپین زبان کا پہلا ترجمہ تھا۔"۲۶

تاہم ڈاکٹر عتیق صدیقی بہ حوالہ یورپی مستشرق گریرسن (Grierson) کے مطابق ہندوستانی زبان پر پہلی کتاب ایک یورپین راہب نے تالیف کی۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> "گریرسن (Grierson) کے بیان کے مطابق ایک یورپین راہب فرانسسکس ترونن سس (Franciscus M.Turonensis) سب سے پہلے اس میدان میں اُترا۔ اس نے ۱۷۰۴ء میں ہندوستانی زبان کا ایک لغت سورت میں بیٹھ کر مرتب کیا جو دو حصوں پر مشتمل تھا، اور ہر حصہ دو کالمی چار پانچ سو صفحات پر پھیلا تھا۔ گویا یہ لغت اورنگ زیب (مغلیہ شہنشاہ) کے انتقال (۱۷۰۷ء) سے تین سال قبل مرتب کیا گیا تھا اور تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھا۔ ایک زمانے میں اس لغت کا مسودہ شہر روم کے کسی کتب خانے میں محفوظ تھا، مگر ۱۸۹۰ء میں جب گریرسن نے وہاں اس کی جستجو کی تو یہ مل نہ سکا۔" (۲۷)

اس کے علاوہ لغت اور صرف و نحو پر مختلف کتابیں لکھی گئیں۔ انجیلِ مقدس کے مختلف ترجمے اُردو میں شائع ہوئے۔ ان میں سے چند ایک کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱۷۴۴ء میں ڈیوڈ مل (David Mill) نے دوسری زبانوں کے حروف سے موازنہ کرتے ہوئے ہندوستانی حروفِ تہجی پر ایک مختصر کتاب (Lingua Hindostanica) لکھی۔

ہیڈلے (Hadley) کی اُردو صرف و نحو ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اُردو کے الفاظ فارسی رسم الخط میں ہیں۔ زبان و بیان کے نقائص کے باوجود اس کتاب کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، اس کے متعلق عتیق صدیقی لکھتے ہیں:

> "اس دور میں کسی اور کتاب کے شاید ہی اتنے ایڈیشن نکلے ہوں جتنے ہیڈلے کی کتاب کے نکلے۔" (۲۸)

فرگوسن (Furguson) نے ۱۷۷۳ء میں ہندوستانی لغت (A Short Dictionary of the Hindostan Language) لکھی جو دو حصوں میں لندن سے شائع ہوئی اور ہندوستانی زبان کے قواعد پر ایک مقالہ بھی تحریر کیا۔[۲۹]

اس کے بارے میں عطش درانی کی رائے ہے:

"اپنے پورے دائرۂ لغات کے لحاظ سے جو پہلی کتاب ہمارے سامنے آتی ہے، وہ جے فرگوسن کی "ڈکشنری آف دی ہندوستانی لینگوئج" ہے۔"[۳۰]

ممکن ہے، بعض اور کتابیں بھی ان موضوعات پر لکھی گئی ہوں مثلاً ایک یورپین کی اُردُو فرہنگ پر، سردار علی کے مختصر تذکرہ "یورپین شعرائے اُردُو" کے مطابق ایک کتاب کا ذکر ملتا ہے، جس میں اُردُو کے مترادف الفاظ بھی موجود ہیں مگر یہ دستیاب نہیں ہو سکی۔"[۳۱]

برٹش انڈیا کمپنی کے کچھ سول اور کچھ افسروں نے بھی ہندوستانی زبان کے قواعد و لغت کی جانب توجہ کی تو کمپنی ایک نوجوان اور سول ملازم گلسٹن نے ہندوستانی زبان کے قواعد پر ایک کتاب لکھی۔ عتیق صدیقی کے مطابق:

"وہ (کمپنی کے) گورنر ون سی ٹارٹ (Vansittart) کا سیکرٹری اور فارسی مترجم تھا۔ ہندوستانی زبان کے قواعد پر اس نے انگریزی میں ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا۔ گلسٹن ایک فساد میں کام آیا اور اس کی بے وقت موت کی وجہ سے اس کی یہ علمی کاوش منظر عام پر نہ آ سکی۔"[۳۲]

کم و بیش اسی دور میں میں ڈف نے ہندوستانی گرامر پر جو کتاب لکھی، مولوی عبدالحق کے خیال میں اس میں اُردُو قواعد کی بہت سی غلطیاں ہیں۔[۳۳]

مگر بہر حال یہ ابتدائی کاوشوں میں سے ایک ایسی کاوش ہے، جسے یوں نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ مقامی طور پر اہل زبان و بیان نے اس کی جانب توجہ نہیں کی تھی اور زبان و بیان کے متعینہ اصول بھی حتمی نہیں تھے۔ زبان کا تدریجی عمل مرورِ ایام کا ہمیشہ محتاج رہا ہے اور پہلے سے بہتری کا سلسلہ یوں ہی آگے بڑھتا رہا ہے اور یہی انسانی تاریخ اور زبانوں کے ارتقا اصول ہوا کرتا ہے۔ ارتقا کے نتیجے میں ہی معاشرے اور زبانیں آگے کی جانب سفر جاری رکھتی ہیں۔ یورپین مصنفین کی یہ ابتدائی سطح کی کتابیں تھیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ نے اہلِ یورپ کو اُردُو زبان کی

تحقیق اور لسانی جائزوں کی جانب راغب کیا اور پھر مزید تحقیق و تصنیف کے جذبے نے اُردو زبان سے اُن کی باقاعدہ وابستگی پیدا کر دی۔

۱۸۸۶ء میں جان بیلیٹس کی "اُردو کلاسیکی ہندی انگلش ڈکشنری شائع ہوئی۔ ۱۹۶۰ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی جانب سے اس کا ایک اعلیٰ ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ دیگر بہت سے ایڈیشنوں کی اشاعت کے علاوہ ۱۹۸۳ء میں اس کا ایک ایڈیشن سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور سے بھی شائع ہو چکا ہے۔ (۳۴)

۱۷۹۰ء میں اُردو کا مکمل لغت ڈاکٹر ہنری ہیرس نے "ڈکشنری آف انگلش اینڈ ہندوستانی" کے نام سے مدراس سے شائع کیا۔ یہ اپنے موضوع کے حوالے سے ایک جامع اور حوالہ جاتی کتاب ہے۔ اس طرح ۱۷۹۰ء ہی میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی "انگلش ہندوستانی ڈکشنری" شائع ہوئی جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا، جس کے بارے میں عطش درانی لکھتے ہیں:

> "اس لغت کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تدوین کے اس وقت کے جدید ترین معیار کو سامنے رکھا گیا ہے۔ صفحات کے نمبر نہیں دیے گئے، البتہ ہر صفحہ دو کالموں پر منقسم ہے اور ان کالموں کے نمبر دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اشاریہ کے ۵۸ صفحات ہیں۔ کتاب کے اواخر میں اغلاط نامہ درج کیا گیا ہے۔ الفاظ لکھنے سے پہلے ان کے ماخذ (زبان) کو درج کیا گیا ہے اور معانی بتانے سے پیش تر بتایا گیا ہے کہ یہ کس لفظ سے مشتق ہے اور اس کا تلفظ کیا ہے۔ اگر سنسکرت کا لفظ ہے تو دیوناگری رسم الخط میں بھی اسے تحریر کیا گیا ہے۔ زیادہ تر ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی، ترکی، یونانی اور انگریزی ماخذوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔" (۳۵)

چناں چہ اس حوالے سے بھی ہمیں اُردو کے بہت بڑے محسن ڈاکٹر گل کرسٹ کی تصانیف اور اُن کی اُردو خدمات کا احترام کرنا پڑتا ہے، جنھوں نے اُردو کی ترقی میں ایسا کردار ادا کیا جو مقامی اُردو شناسوں سے بھی ممکن نہ ہو سکا تھا۔

گل کرسٹ کی اُردو خدمات کا اگر مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ کہنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ اُردو زبان کا وہ واحد محسن ہے، جس نے اُردو زبان کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لیے اپنی زندگی کا ایک اہم حصہ نذر کر دیا۔ اُردو ادب کے مختلف تذکروں یا مقالہ جات میں گل کرسٹ کا ذکر اور اُن کی اُردو خدمات پر جو کچھ مواد ملتا ہے،

تاریخِ ادب اُردُو کے ایک تاریخی تسلسل کے طور پر ہے اور کھلے دل سے اُن کا اعتراف بھی کیا گیا، اور گل کرسٹ کی اردو زبان کی خدمات اور نمایاں کارناموں کے تناظر میں اُردُو ادب کے محقق و نقاد عتیق صدیقی نے توجہ دی اور ''گل کرسٹ اور اس کا عہد'' جیسی اہم کتاب لکھ کر تحقیق و تالیف کا حق ادا کیا، چناں چہ یہاں گل کرسٹ کی شخصیت و خدمات کا پہلو ایک ایسے مستشرق کے طور پر مختصراً کیا جارہا ہے جو مذہباً مسیحی ہے، مگر ہندوستان میں اس نے اُردُو زبان کے لیے کسی مذہبی تعصب سے کام نہیں لیا اور یہاں کے ہندوئوں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر صرف اُردُو کی خدمت کی ہے۔

ان کا پورا نام جان بورتھ وک گل کرسٹ ہے۔ ۱۷۵۹ء میں اڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں اسکاٹ لینڈ اور انگلستان کے تعلیم یافتہ اُن باشندوں کو ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے لیے بھیجا جاتا تھا جو مختلف علوم میں مہارت رکھتے تھے۔ گل کرسٹ مشرقی علوم اور علم طب میں مہارت رکھتے تھے۔ کمپنی نے انھیں ۱۷۸۲ء میں طبی عہدہ دار مقرر کر دیا۔ بمبئی میں قیام کے ایک سال بعد وہ کلکتہ پہنچے۔ یہاں آ کر انھیں محسوس ہوا کہ مقامی باشندوں کی زبان سے پوری طرح آگاہی کے بغیر وہ کوئی بہتر کام سرانجام نہیں دے سکتے، اگرچہ انھوں نے بمبئی ہی میں ہندوئوں، مقامی عیسائیوں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان اُردُو سیکھنا شروع کر دی تھی، مگر باقاعدہ استعداد کے لیے انھیں وقت چاہیے تھا، چناں چہ ۱۷۸۵ء میں گل کرسٹ کو ہندوستان کے منصرم گورنر جنرل سر جان میکفرسن نے تحقیقِ زبانِ اُردُو کے لیے چُھٹی دے دی۔ یوں وہ ہمہ تن اُردُو زبان کے تحقیقی مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے دورے بھی کیے اور ہندو پنڈتوں اور مسلمان علما کی مدد سے اُردُو زبان میں مہارت حاصل کر لی۔ نہ صرف یہ بلکہ مشرقی زبانوں خاص طور پر اُردُو سے ایسا شغف پیدا ہو گیا کہ اپنی تمام عمر اُردُو زبان کی تحقیق اور اشاعت میں صرف کی۔

اُردُو زبان کے اس تحقیقی عمل میں انھیں اندازہ ہوا کہ اب فارسی زبان کی جگہ اُردُو زبان ہی لے گی اور خاص طور پر جو علاقے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے تصرف میں ہیں، وہاں فارسی کے بجائے اب علمی سطح پر بھی اُردُو ہی کو رائج ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں شروع میں ان کے اس نقطۂ نظر پر کسی نے توجہ نہ دی، بالآخر یورپی ماہرین نے ان کی رائے کو قبول کر لیا اور ۱۸۳۲ء میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت اُردُو زبان کو سرکاری زبان بنا دیا گیا۔ کمپنی کا قیام چوں کہ ۱۸۰۱ء میں عمل میں آ چکا تھا اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی خدمات فورٹ ولیم کالج کے لیے وقف تھیں، اس لیے ایک تو اُردُو زبان میں کتابوں کا بہت سا کام ان کی شب و روز محنت کے حاصل کے طور پر موجود تھا، دوسرے خود

ہندوستانیوں کے لیے یہ زبان عام بول چال کی زبان بن چکی تھی، اس لیے اُن کی رائے پر کسی نے اختلاف نہ کیا۔ یہ اُردُو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ڈاکٹر گل کرسٹ جیسا مخلص صاحبِ علم اور اُردُو زبان کا محسن میسر آ گیا اور جہاں بہت سی طبع زاد اور مترجمہ کتابیں خاص و عام کے مطالعے کے لیے عام ہوئیں، وہیں خود ڈاکٹر گل کرسٹ کی تصانیف بھی منظر عام پر آئیں۔ اُن کی ''انگریزی ہندوستانی لغت'' اور ''قواعد اُردُو'' (رسالہ گل کرائسٹ) اس سلسلے کی ابتدائی کڑیاں ہیں۔ اِن کے علاوہ اُن کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ دوسری کتابیں بھی ہیں جو اُردُو زبان کے محققین کے لیے سند کا کام دیتی ہیں۔ اس سلسلے میں ''نقلیاتِ لقمانی''، ''ہندی مینول''، ''ہندوستانی علم اللسان''، ''ہندی کی آسان مشقیں''، ''مکالماتِ انگریزی و ہندوستانی'' اور ''ہندی داستاں گو'' (فارسی اور دیوناگری خط پر مباحث) کا ذکر بطور خاص کیا جا سکتا ہے۔ (۳۶)

اُن کی تصنیف ''انگریزی ہندوستانی لغت'' اُن کی نو سال کی متواتر محنت کا نتیجہ ہے۔ بقول سیّد محمد:

> ''ان کا یہ کارنامہ بذاتِ خود اس قدر اہم ہے کہ اگر وہ کوئی اور کام نہ کرتے تو صرف اس سے ان کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ رہ سکتا تھا۔ اس سے پہلے اُردُو زبان میں کوئی لغت نہ کسی ہندوستانی نے لکھی تھی اور نہ کسی یورپین نے، جس کی وجہ سے ان کا کام بہت صبر آزما اور دقت طلب ثابت ہوا۔ بڑی تلاش اور کوشش کے بعد انھیں صرف خالق باری مؤلفہ حضرت امیر خسرو ملی۔ اس کے سوا کوئی اور نمونہ ان کے آگے نہ تھا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے انگریزی لغتوں کو پیشِ نظر رکھ کر بالکل ابتدائی اور اصولی طریقے پر ادب کی اہم کتابیں جمع کیں اور منشیوں اور پنڈتوں کے معقول عملے کی مدد سے ان کتابوں سے الفاظ انتخاب کر کے ان کے معنی اور موقع استعمال کا تعین کیا۔'' (۳۷)

اور ظاہر ہے یہ پہلا کام تھا جو ڈاکٹر گل کرسٹ نے انجام دیا اور بعد میں مرتب ہونے والی اُردُو لغتوں کے لیے ماخذ و رہنما ثابت ہوا۔ کسی بھی اعتبار سے ڈاکٹر گل کرسٹ کے اس کام اور اُن کی مجموعی اُردُو خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس اعتبار سے عتیق صدیقی کی رائے ملاحظہ ہو:

> ''ہمارے مستند مؤرخین و محققین نے گل کرسٹ کی خدمات کا جس احسان مندی و شکر گزاری کے ساتھ اعتراف کیا ہے، وہ قدیم مشرقی ادب کے روایتی مبالغے پر اگر مبنی نہیں ہے، تو یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ لسانیات اور ادبیات کی تاریخ کا یہ عجیب و غریب

واقعہ ہے، کیوں کہ آج تک کسی غیر ملکی زبان میں کوئی شخص بھی اس مرتبہ کا حامل نہ ہو سکا تھا، جو گل کرسٹ نے ہماری ادبی و لسانی تاریخ میں حاصل کر لیا ہے، لیکن اس سے بھی عجیب واقعہ یہ ہے کہ اپنی زبان اور اپنے ادب کے اتنے بڑے محسن کے متعلق ہماری معلومات عبرت ناک حد تک محدود ہیں۔ گل کرسٹ کب اور کیوں کر ہندوستان آیا؟ یہاں کے دورانِ قیام میں وہ کہاں کہاں رہا، ہماری زبان کا علم حاصل کرنے کے لیے وہ کن دشوار وادیوں سے گزرا؟ طبیب سے ادیب بننے تک کتنی کٹھن منزلیں اس نے طے کیں، ہماری زبان اور ہمارے ادب پر اس کے کیا احسانات ہیں؟ ان سب کا اور اس طرح کے دوسرے سوالوں کا تفصیلی تو در کنار، اجمالی جواب دینے سے بھی ہماری ادبی تاریخیں قاصر ہیں۔'' (۳۸)

یقینی طور پر یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ تاریخی اعتبار سے کسی شخصیت اور اس کے کارناموں کی گواہ معاصر تاریخیں قرار پاتی ہیں، اور ادب کے حوالے سے معاصر تاریخوں کا دارومدار معاصر تذکروں پر ہوتا ہے مگر ہمارے ادب کے معاصر تذکروں میں شاعری اور شعرا کا ذکر تو ملتا ہے جب کہ ہندوستانی یا اُردُو ادب کے متعلق ہماری معلومات ناقص رہ جاتی ہیں اور پھر معاصر شعرا کے تذکروں میں بھی تنقیدی تجزیات اور شخصیت و شاعری کا تجزیاتی عمل مفقود ہے، محض چند ایک معلومات، حرفِ تہجی کی ترتیب سے شعرا کا چند عبارتوں میں موہوم تعارف یا چند شعروں کا انتخاب ہی تذکروں میں جگہ پاتا رہا ہے۔ ادبا اور شعرا کے جائزے کی روایت تو محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آبِ حیات'' سے یا ''آبِ حیات'' کے بعد شروع ہوتی ہے۔

عہدِ گل کرسٹ میں اُردُو زبان کے دیگر مسیحی مستشرقین و محسنین

ڈاکٹر گل کرسٹ جب ''انگریزی ہندوستانی لغت'' تیار کر رہے تھے تو ان کے شریک کار اور معاونین میں دو اہم ناموں کا اعتراف نہ کرنا قرینِ انصاف نہ ہو گا۔ ان میں ایک ٹامس روبک اور دوسرے جوزف ٹیلر ہیں۔ ٹامس روبک نے اُردُو اہلِ قلم کی سرپرستی بھی کی اور خود بھی تصنیفی خدمات سرانجام دیں۔ ان کی ''لغتِ جہاز رانی'' (مطبوعہ ۱۸۱۱ء) میں، جس کے ضمیمے میں قواعدِ اُردُو پر ایک رسالہ بھی شامل ہے، بحریہ اور جہاز رانی کی انگریزی اصطلاحات اور ان کے مترادف اُردُو الفاظ کی جمع و ترتیب کا کام کیا گیا ہے۔ دراصل یہ کتاب ''ایسے الفاظ و جملوں کا

ذخیرہ ہے جو انگریز کمانداروں کو میدانِ جنگ اور بارکس میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بول چال میں کارآمد ہو سکتے ہیں۔'' (۳۹)

اس ضمن میں سید محمد لکھتے ہیں:

''ٹامس روبک 'ہندوستانی لغت' کی تدوین میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے شریکِ کار اور ان کی تجویز کے ہر طرح ممد و معاون تھے۔''(۴۰)

جوزف ٹیلر فورٹ ولیم کالج کے پروفیسر تھے۔ ابتدا میں انھوں نے ایک اُردُو انگریزی لغت مرتب کی تھی جو اُن کے ذاتی مطالعے کے لیے فرہنگ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ پھر اشاعتی مقصد کے لیے انھوں نے اس کی نئے سرے سے تدوین کی اور اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۸ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۲۰ء میں اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن بھی چھپ گیا۔(۴۱)

اُردُو لغت کے حوالے سے جان شیکسپیئر کا کام بھی اہم نوعیت کا حامل ہے۔ اُن کی مطبوعہ ''اُردُو لغت'' (۱۸۱۳ء)اور ''منتخباتِ ہندی'' دو جلدوں میں مرتب ہوئی۔

''اس کی پہلی جلد میں میر شیر علی افسوس کی تاریخ ہند (آرایشِ محفل) کے دس باب کا انگریزی ترجمہ شامل ہے اور دوسری مجلس میں اُردُو نثر و نظم کا انتخاب ۲۰۰ صفحہ کا اور ہندی نثر کا انتخاب ۴۸ صفحے کا ہے۔ انتخاب میں کہانیاں ہیں جو اکثر سنگھاسن بتیسی سے لی گئی ہیں اور اُردُو انتخاب میں مختلف شہروں کا مفصل حال ہے، مثلاً دہلی، آگرہ، الہ آباد، اجودھیا، ڈھاکہ، کشمیر، کابل وغیرہ نظم میں میر حسن، سودا، میر کی مثنویوں کا انتخاب ہے۔''(۴۲)

ان مستشرقین کی دیگر جو کتابیں تالیف و ترتیب کے عمل سے گزریں، ان کی ایک مختصر فہرست یوں بنتی ہے:

۱۔ ولیم ٹیٹ، مقدمہ زبانِ ہندوستانی، مطبوعہ کلکتہ، ۱۸۲۷ء

۲۔ ایس ڈبلیو، قواعدِ زبان ہندوستانی، مطبوعہ لندن، ۱۸۳۰ء

۳۔ اسٹیم فورڈ ڈارناٹ، جدید خود آموز قواعدِ زبانِ اُردُو، مطبوعہ لندن، ۱۸۳۱ء

۴۔ جیمس آر بالن ٹائن، ہندوستانی گرامر، مطبوعہ لندن، ۱۸۴۴ء

۵۔ ڈنکن فاربس، ہندوستانی لغت، مطبوعہ لندن، ۱۸۴۷ء

۶۔ الیف، فیلن، تذکرہ شعرا ہند، مطبوعہ ؟، ۱۸۴۴ء

۷۔ ریونڈ جی اسمال، ہندوستانی گرامر، مطبوعہ لندن، ۱۸۴۷ء

۸۔ جی دت پراخنو (جرمن محقق)، ہندوستانی گرامر، مطبوعہ برلن، ۱۸۵۲ء

۹۔ برٹرینڈ (فرانسیسی محقق)، اُردُو لغت، مطبوعہ پیرس، ۱۸۵۸ء

۱۰۔ ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن نے چار کتابیں مرتب کیں:

(۱)۔ ہندوستانی انگلش ڈکشنری

(۲)۔ انگلش ہندوستانی ڈکشنری

(۳)۔ ہندوستانی انگلش قانونی ڈکشنری

(۴)۔ انگلش ہندوستانی قانونی ڈکشنری (۴۳)

"دوسرے نمبر کی کتاب سب سے آخری ہے۔ ۱۸۷۹ء میں اس کو مرتب کرنا شروع کیا، ۱۸۸۰ء میں (فیلن کا) انتقال ہو گیا۔ باقی کام ڈاکٹر صاحب کے مددگاروں (یعنی لالہ فقیر چند، لالہ چرنجی لال، لالہ ٹھاکر داس، لالہ جگن ناتھ اور مسٹر واٹلنگ) نے پورا کیا اور ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔"(۴۴)

یہ محض چند کتابوں کا ایک مختصر خاکہ ہے ورنہ اگر مجموعی جائزہ لیا جائے تو مسیحی اہلِ ادب کی اُردُو خدمات کا دائرۂ کار اس حوالے سے خاصا وسیع ہے۔

عتیق صدیقی کی "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں ہمیں جن یورپی محسنینِ اُردُو کا ذکر بھی ملتا ہے، ان کی اُردُو خدمات کا ایک وقیع و معتبر دفتر ہے۔ گل کرسٹ کے زیر نگرانی فورٹ ولیم کالج میں اہلِ زبان مؤلفین، مترجمین اور مصنفین کی خدمات کا دائرہ اپنی جگہ ایک خاص ادبی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے نثری اُردُو ادب کا سرمایۂ عظیم متصور ہوتا ہے، تاہم اسی دائرۂ کار میں بشمول گل کرسٹ جن مستشرقین (جو مذہباً مسیحی تھے) نے اُردُو کے دائرۂ اثر کو بڑھانے میں کام کیا۔ عیسائی مشنریوں نے جو اپنا مذہبی فریضہ ادا کیا اور اس سلسلے میں بائبل کے اُردُو ترجمے اور مذہبی و تبلیغی لٹریچر بھی شائع کیا، لیکن جو کتب اُردُو زبان و ادب کے حوالے سے تحریر ہوئیں، ان کے جستہ جستہ ذکر سے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ مسیحی اہلِ علم و ادب نے اُردُو کو خود سمجھنے اور پھر اس پر کام کرنے میں کیا کیا دشواریاں اُٹھائی ہوں گی۔ پھر یہ بات کہ اُردُو سے اُن کی محبت و دل بستگی اس حد تک آگے بڑھی کہ آگے چل کر انھوں نے اُردُو زبان کے قواعد اور لغتوں تک ہی خود کو محدود نہ کیا بلکہ تخلیقی و تالیفی کاموں کا حصہ بھی بنے اور خود بھی مکمل طور پر شاعر اور ادیب کے طور پر اپنا نام زندہ کر گئے۔

گارسیں دتاسی کی تحقیقی و علمی کاوشیں

فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی (۱۷۹۴ء۔۱۸۷۸ء) کی اُردُو کے لیے خدمات کا دائرۂ کار اگرچہ گل کرسٹ کے دائرۂ خدمات سے بظاہر محدود ہے مگر تحقیقِ زبان و ادب اور اُردُو ادب کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے کے باعث (اگر تقابل نہ سمجھا جائے تو) وہ گل کرسٹ سے کسی حد مختلف النوع کام کرنے میں انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ ایک مستشرق نے پہلی بار انفرادی حیثیت سے شعرائے اُردُو کی تاریخ (Histories de la Litterature Hindoui et Hindoustani) (مطبوعہ پیرس، ۱۸۳۹ء) مرتب کرنے میں خصوصی کاوشوں سے کام لیا اور اپنے تمام ذہنی تسلسل کے ساتھ خطباتِ اُردُو کا سلسلہ شروع کیا۔ اُن کے یہ خطبات مرتب ہو کر انجمن ترقیِ اُردُو سے شائع ہو چکے ہیں۔ اور اس کا ''تذکرہ شعرائے اُردُو'' میں بھی جو دو جلدوں میں اور بعد میں تین جلدوں میں مکمل کیا گیا تھا اور اُردُو میں اپنے مترجمہ نام کے مطابق ''تاریخِ ادبیاتِ ہندوی و ہندوستانی'' سے موسوم تھا، اب اُردُو میں لیلیان سیکستن نازرو کے مکمل ترجمے اور ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ دتاسی کا یہ تذکرہ فیلن کے تذکرہ ''طبقاتِ شعرائے ہند'' جو مولوی کریم الدین کی مشارکت سے لکھا گیا تھا، پہلے شائع ہو چکا تھا۔ فیلن کا تذکرہ پہلی بار ۱۸۴۸ء میں مطبع العلوم، دہلی سے شائع ہوا تھا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ بہت تذکرے جمع کر کے اس تذکرے کو فراہم کروں لیکن مجھ سے پہلے چوں کہ ڈی ٹاسی نے زبانِ فرنچ میں درمیان ملک فرانس کے ایک تذکرہ ان تذکروں مفصلۂ ذیل سے بہت اچھی طرح تالیف کر دیا تھا، اس لیے اور دوسرے تذکروں سے جو اس کو دستیاب نہیں ہوئے اور اس تذکرے سے مدد لے کر یہ تذکرہ میں نے فراہم کیا۔'' (۴۵)

یوں بظاہر ''طبقاتِ شعرائے ہند'' کا ایک ماخذ دتاسی کا تذکرہ بھی رہا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فیلن نے انگریزی اور مولوی کریم الدین نے انگریزی سے اُردُو میں اس کا ترجمہ کیا جو ''طبقاتِ شعرائے ہند'' کے نام سے معروف ہوا۔ (۴۶)

دتاسی کے اس تذکرے (تاریخ) کی تین جلدوں میں مکمل اشاعت کے بعد دوسرا ایڈیشن خاصے اضافوں کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اس کی تفصیلات ڈاکٹر معین الدین عقیل کے مقدمہ سے یوں ملتی ہیں:

''اس تصنیف کا دوسرا ایڈیشن خاصے اضافوں کے ساتھ 'ایشیاٹک سوسائٹی، پیرس' کے زیرِ اہتمام تین جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی، جو پیش لفظ کے ۴ اور متن کے ۶۲۴ صفحات پر مشتمل تھی۔ متن میں ۷۰ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے، جس میں مصنف نے اُردُو زبان اور اس کے اسالیب اور اس کتاب کے مآخذ کا تعارف تحریر کیا ہے اور ذیل میں ادبی اصناف اور اصطلاحات کی تشریح کی ہے اور پھر تذکروں کا تعارف کرایا ہے جو اس کتاب کے مآخذ کی حیثیت میں اس کے پیشِ نظر رہے۔ یہ تذکرے تعداد میں ۶۶ تھے۔ متن کا وہ حصہ جو صفحہ ۷۳ سے شروع ہوتا ہے، شعرا و مصنفین کے تراجم پر مشتمل ہے اور حروفِ تہجی کی ترتیب میں مولوی مظہر علی حضوری کے ترجمہ پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں صفحہ ۶۱۹ سے ۶۲۴ تک محمد عاجز کے ''قصۂ لعل و گوہر'' پر وضاحتی و تنقیدی شذرہ تحریر کیا ہے، جس کا ذکر اس نے صفحہ ۶۸۔۶۹ پر متن میں کیا تھا۔ اس طرح یہ جلد صفحہ ۶۲۴ پر ختم ہوتی ہے۔

دوسری جلد بھی ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی جو رومن حرف اور عبارت حاجی مرزا عابد بیگ زائر کے ترجمے سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں حکیم سید عنایت حسین رسوا تک کا ترجمہ شامل ہے جو صفحہ ۵۹۴ پر ہے۔ اسی صفحہ سے مستعان شاہ مدراسی اور الٰہی بخش نشاط کے ذیل میں ان کی مذکورہ مثنوی پر اضافی معلومات درج کی ہیں، جو صفحہ ۶۰۸ تک محیط ہیں۔

تیسری جلد ایک سال کے بعد ۱۸۷۱ء میں اسی اہتمام اور تسلسل میں شائع ہوئی۔ اس کا آغاز ایک استدراک سے ہوتا ہے جو ۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے اسے ۱۵ اکتوبر ۱۸۷۱ء کو تحریر کیا۔ اس میں سابقہ دو جلدوں کے مندرجات میں حرف 'ک'، 'و'، (W) تک شروع ہونے والے مصنفین و شعرا کے تراجم مختصراً شامل کیے ہیں۔ خواتین کے ناموں کی فہرست اسی ذیل کے آخر میں شامل کی گئی ہے۔ اس جلد کا متن حرف 'س' کے اولین شاعر میر سعادت علی کے ترجمہ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۳۵۳ پر مولوی ذوالفقار علی کے ذکر پر مکمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۳۵۵ سے ۳۷۶ تک اختتامیہ تحریر ہے، جس میں تصحیح و اضافے [اضافہ] کیے گئے [کیا گیا] ہے۔''(۴۷)

گارسیں دتاسی کی اُردُو زبان پر کتابوں اور خطبات کے علاوہ دیگر بہت سی ایسی کتب بھی جو انھوں نے اُردُو سے فرانسیسی زبان میں منتقل کیں۔ دتاسی کی ادبی تاریخ کے مترجم لیلیان سیکستن نازرو نے اس کی مترجمہ کتابوں کی جو تفصیل دی ہے، مختلف النوع موضوعات کے طور پر اُن کی تعداد ۱۸ ہے۔ اس طرح اُن کی تصانیف کی تعداد ۱۶ بتائی گئی ہے۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کی الہامی کتاب قرآن سے متعلقہ موضوعات پر بھی کتابیں تصنیف کیں۔ (۴۸)

اہم بات یہ کہ دتاسی نے ہندوستان آنے کے بجائے اپنے ملک میں رہتے ہوئے اُردُو زبان پر لیکچر دیے۔ اُردُو سے اُس کی دل چسپی کا باعث یقینی طور پر وہ کتابیں ہوں گی جو اس سے قبل اس کے بعض ہم وطن اور دیگر مستشرقین نے لکھی تھیں۔ دتاسی کی دیگر کتابوں کے علاوہ "تاریخ ادبیاتِ اُردُو (Historie de la Litterature Hindouie et Hindoustanie)" اُردُو ادب پر بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح "خطبات گارسیں دتاسی" بھی تحقیقِ زبان و ادب اور تاریخِ ادب پر ابتدائی کام کی خصوصیت کے اعتبار سے فراموش نہیں کیے جاسکتے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جدید تعلیم کے لیے پیش رفت

۱۸۵۷ء کے انقلاب سے ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے براہِ راست سلطنتِ برطانیہ کو منتقل ہو گئی۔ بنگال اور دکن جیسے بڑے صوبے پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے تصرف میں تھے، اب اودھ کا صوبہ بھی بادشاہِ اودھ واجد علی شاہ کو معزول کر کے برطانوی گورنمنٹ میں آ گیا اور اسی طرح دہلی کی مرکزی حکومت، جو مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے زمانے ہی سے دگرگوں تھی، آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری سے ختم ہو گئی۔ اس سے قبل سکھ حکمرانی کے خاتمے اور ۱۸۴۹ء کے الحاقِ پنجاب کے بعد پنجاب میں انگریز حکومت کی عمل داری قائم ہو چکی تھی، چناں چہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں شریک رہنے والے کیا ہندو، کیا مسلمان دہلی اور دیگر اضلاع کے ساتھ ساتھ پنجاب میں بھی گرفتاریاں شروع ہو گئیں اور قتل و غارت میں حصہ والے افراد کو پھانسیاں اور دیگر سزائیں دی گئیں۔ مغلیہ خاندان پر بھی ظلم و ستم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شاہی خاندان کے کئی لوگ اپنی جانیں بچانے کے لیے چھپتے چھپاتے مختلف علاقوں میں نکل گئے۔ کم و بیش ۱۸۵۸ء تک یہی ہنگامہ گرم رہا۔ آخرِ کار گورنمنٹ برطانیہ کی جانب سے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ اب ملک میں مختلف سرکاری اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ نئی پالیسیاں وضع کی گئیں اور ان پر عمل درآمد کروانے کے لیے باضابطہ تگ و دو کی گئی۔ گورنمنٹ کی اب زیادہ تر توجہ تعلیمی پالیسیاں

بنانے اور اس سلسلے میں تعلیمی اداروں کے قیام کی جانب تھی۔ مختلف انگریزی اخبارات کا اجرا ہوا۔ دیسی اخبارات نے بھی گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسیوں کی حمایت میں کام کیا۔ دہلی، کلکتہ، لاہور اور دیگر شہروں میں سرکاری کالج قائم کر دیے گئے۔ تعلیمی و علمی ترقی کے لیے سرکاری لائبریریوں کا قیام بھی عمل میں آیا، تاہم مسلمانوں میں سے ابھی تک بہت سے لوگ انگریزی تعلیم کے مخالف تھے، مگر چند ہی برسوں میں انگریزی تعلیم کے بغیر جب ان کی اولادوں کو سرکاری ملازمتیں ملنا ناممکن ہو گیا، اور ہندوئوں نے انگریزی تعلیم حاصل کر کے ملازمتیں حاصل کرنا شروع کر دیں تو سر سید احمد خاں نے علی گڑھ میں مسلم کالج کی بنیاد رکھی، جہاں جدید تعلیم کی جانب لوگوں کو ابھارا۔ اس کے لیے انھوں نے انتھک محنت اور شب و روز کی کوششوں کے ساتھ وسیع تر مخالفت کے باوجود اپنا کام جاری رکھا۔ مسلمانوں کا ایک مذہبی اور دانش ور طبقہ اگرچہ سر سید کے مخالف تھا، مگر سر سید کی تعلیمی تحریک اور عملی کاوشوں کی کامیابی کے باعث بالآخر وہ بھی سر سید کی حمایت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ سر سید کی سب سے اہم کوشش اس دور میں یہ نظر آتی ہے کہ انھوں نے سیاسی اور مذہبی مناقشت کو ختم کرنے میں اپنا پورا کردار ادا کیا۔ انھوں نے عیسائیوں اور مسلمانوں کی معاشرت اور مذہب میں ہم آہنگی کے کئی ایسے پہلو نکالے جن سے انھیں توقع تھی کہ مذہبی، سیاسی، قومی، معاشرتی اور سماجی اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ اگرچہ وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے کہ ان کے خلاف نظریاتی محاذ پر علمائے ہند نے اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ یہاں تک کہ ان پر کفر کے فتوے لگائے گئے مگر سر سید ہٹ کے پکے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان میں انگریز کی حکومت اب قائم ہو چکی ہے اور ہمیں ان کی مخالفت کے بجائے شانہ بہ شانہ کام کرنا چاہیے۔ سر سید کا مذہب کے لحاظ سے اپنا ایک نظریہ تھا اور اس پر رجعت پسند علما کی مخالفت کے باوجود اپنے نظریات اور مذہبی عقاید میں بھی راسخ تھے مگر سیاسی اعتبار سے انگریزی حکومت کے لیے ان کا نقطۂ نظر یہ بھی رہا:

> ''کوئی مسلمان یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ انگریز اہلِ کتاب نہیں ہیں۔ کوئی مسلمان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ کوئی غیر مذہب والے مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے۔ اگر ہو سکتے ہیں تو وہ عیسائی ہیں۔''(۴۹)

سر سید احمد کی تحریک کو علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ اس دور کی ایک ایسی بڑی تحریک تھی، جس کے اثرات حاکم و محکوم تمام ہندوستانی اقوام پر ہوئے اور اس کے براہِ راست اثرات نئے ادب پر

نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ادبی اور تعلیمی لحاظ سے جہاں مسلمانانِ ہند کو علی گڑھ تحریک سے فائدہ پہنچا، وہیں اہلِ انگلستان یعنی حکومتِ وقت کو بھی سیاسی اعتبار سے بہت سے فوائد حاصل ہوئے۔

یہ وہ دور ہے جب اُردُو شاعری کا ستارہ عروج پر تھا۔ ذوق اور غالب اپنی شاعری کے ذریعے اپنا مقام و مرتبہ منوا کر دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ کا علمی و ادبی ستارہ بامِ عروج پر روشن ہونا شروع ہو چکا تھا۔ ایک جانب مذہبی تحریکیں اپنی اپنی مذہبی روایات کے ساتھ علمی اور تبلیغی کاموں میں مصروف تھیں۔ دارالعلوم دیوبند اور بالخصوص ندوۃ لعلما نے جہاں مذہب اسلام اور اس کے متعلقہ علوم پر کتابیں لکھنا اور شائع کرنا شروع کر دیں تھیں، وہیں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں علمی کاموں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بے شمار انگریزی اور عربی کتابوں کے تراجم ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اُن کا تالیفی اور تصنیفی کام بھی سامنے آنے لگا۔ اس اعتبار سے انیسویں صدی کے ربعِ ثانی کے آخری سالوں میں ڈاکٹر لائٹنر نے انگریز حکومت کی مدد سے جو تعلیمی کام شروع کیا تھا، کسی حد تک اس کے اثرات دیگر تحریکوں پر بھی نمایاں ہوئے مگر اصلاً ہندوستانی اقوام کے وسیع تر مفاد میں جو کام اُن کی زیرِ نگرانی انجام پایا، اس کے اثرات کچھ اس انداز میں اُردُو ادب پر ظاہر ہوئے کہ ہمارا ادبی منظر نامہ ہی تبدیل ہو گیا۔ اس لحاظ سے جدید شعر و ادب اور نئے تعلیمی نظام کو مستحکم بنیادوں پر کھڑا کرنے میں ڈاکٹر لائٹنر کی کاوشیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

انجمنِ پنجاب کا قیام، اغراض و مقاصد اور خدمات

مسیحی اہلِ ادب کے دائرۂ کار کو سمجھنے کے لیے انجمنِ پنجاب کے اغراض و مقاصد اور اس کا دائرۂ اثر ایک اہم کڑی ہے۔ لاہور میں ۲۱/ جنوری ۱۸۶۵ء کو انجمنِ پنجاب کا قیام عمل میں آیا اور اس کے صدر ڈاکٹر ڈبلیو۔جی۔لائٹنر مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹنر اس سے قبل گورنمنٹ کالج، لاہور کے پرنسپل تھے۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد مشرقی علوم کا احیا، لسانیات، بشریات، تاریخ اور ہندوستان کے ہمسایہ ملکوں میں ہونے والے تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی تھی۔ اس کے علاوہ مقامی ہندوستانی زبانوں کے ذریعے تعلیم کا فروغ ایک بنیادی ضرورت تھی، تاہم اس سے متعلقہ ادب کو وقت کی ضرورت کے مطابق ترقی دینے کا عملی اقدام پیشِ نظر تھا۔ اس کے لیے مختلف زبانوں کے لیے اہلِ علم افراد پر مشتمل کمیٹیاں ترتیب دی گئیں۔ انجمن کے قیام کے بعد مختلف اوقات میں باقاعدہ اجلاس منعقد ہوتے رہے، جن میں مضامین وغیرہ پڑھے جاتے اور ان پر گفتگو بھی ہوتی۔ (۵۰)

انجمن کا قیام ہر لحاظ سے اُردُو شعر و ادب کے نئے دور کا سر نامۂ آغاز تھا۔ اس حوالے سے سید عبد الحیی لکھتے ہیں:

> ''یہ نیا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم ہو کر آئے اور ان کو اُردُو زبان کی اصلاح کی طرف توجہ ہوئی۔ اس کے لیے انھوں نے اُردُو میں قواعد کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرائیں، اُردُو نثر میں قصے لکھوائے، مضمون نگاری کو ترقی دینے کے واسطے ایک سرکاری اخبار نکالا اور ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ (۵۱)

انجمنِ پنجاب کو ڈاکٹر لائٹنر نے اپنی مخلصانہ خدمات کے ساتھ جو مقام بخشا تھا، وہ لائقِ اعتبار ہی نہیں بلکہ ہندوستان میں اس وقت کے علمی، ادبی، سماجی و سیاسی منظر نامے کا روشن ترین باب سمجھا جا سکتا ہے۔ دیگر مقامی تحریکوں کے مقابل مقامی لوگوں میں جدید تعلیم کا ذوق پیدا کرنا اور جدید علم و ادب کے ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی شعور کی بیداری انجمن اور ڈاکٹر لائٹنر کی شب و روز مساعی کا نتیجہ تھی۔ انجمن کی وسیع تر خدمات کے جائزے اور ڈاکٹر لائٹنر کی علمی شخصیت کے حوالے سے یہ اہم بات سامنے آتی ہے کہ:

> ''ڈاکٹر لائٹنر جب لاہور پہنچے تو اس وقت شمالی ہند اور پنجاب میں کلکتہ یونیورسٹی کا اقتدار مسلط تھا جو یہاں کی ذہنی فضا سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ انھوں نے پنجاب اور شمالی ہند کے نصابات کو ان کا صحیح مقام دلانے میں پُرزور جدوجہد کی اور وہ اس میں اس حد تک کامیاب ہوئے کہ یہاں کے لوگ حکومتِ وقت کے احکامات پر تنقید کرنے کے لائق ہو گئے، جس پر گورنر کی طرف سے انھیں تہدیدی خط لکھا گیا اور ڈیوک آف ونڈسر کی آمد پر انھیں انقلاب و اعزاز سے محروم رکھا گیا۔ انجمن پنجاب کی بنیاد جو اگرچہ انھوں نے حکومت کے ایما پر ہی ڈالی تھی، لیکن یہ انجمن بہت سے پنجاب کے اہلِ فکر و نظر کی نمایندہ بن گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر لائٹنر اپنی ذات میں یہاں ایک ایسی قوت بن گئے تھے، جس کے ارکانِ حکومت خواہ وہ مرتبہ میں سے برتر ہوں یا فروتر، خائف رہتے تھے، لیکن پنجاب کے قوام کے وہ محسن تھے۔ انھوں نے یہاں رہ کر ان کے لیے تہذیبی جنگ لڑی تھی۔ طرح طرح کی مشکلات کے باوجود حکومت سے مشرقی علوم

اور دیسی زبانوں کی اہمیت کو تسلیم کروالیا۔ یہ ڈاکٹر لائٹنر کی مسلسل جدوجہد اور ہمت و استقامت کا نتیجہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی نے اپنے مقاصد میں اسی تہذیبی عنصر کو سرِ عنوان بنالیا، جس میں دیسی زبانوں کی ترقی اور مشرقی علوم و السنہ کے فروغ کو بنیادی اہمیت دی گئی۔"(۵۲)

لارڈ میکالے کی ہندوستان میں تعلیمی پالیسی میں ایک اہم شق یہ بھی کہ یہاں کا نصابِ تعلیم انگریزی میں ہونا چاہیے۔ مقامی اہلِ علم کے علاوہ خود ڈاکٹر لائٹنر نے بھی اس کی مخالفت کی تھی اور تعلیم کے لیے مقامی زبانوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے، انگریز حکام کو اپنے دلائل سے قائل کر لیا تھا۔ اس حوالے سے بھی ہندوستان میں علومِ جدید اور اس کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم حاصل کرنے والے طلبا پر ڈاکٹر لائٹنر کا یہ احسان ہمیشہ یاد رہے گا۔

انجمن پنجاب اور ڈاکٹر لائٹنر کی تعلیمی و علمی خدمات کے ضمن میں یہ پہلو بھی لائقِ توجہ ہے کہ لیفٹیننٹ گورنر کی خواہش اور ناظمِ تعلیماتِ پنجاب کرنل ہالرائیڈ کے ایما سے جدید اُردُو نظم کے مناظموں کا آغاز کیا گیا اور اُردُو کے نام ور انشا پرداز مولانا محمد حسین آزاد کی خدمات حاصل کی گئیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

"پنجاب کے سرکاری مدارس میں اُردُو کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، انھیں دیکھ کر لیفٹیننٹ گورنر نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ان میں نظمیں بالکل نہیں ہیں اور یہ خواہش ظاہر کی کہ مدارسِ سرکاری کے ذریعے ایسی نظم کا رواج ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہو۔ لیفٹیننٹ گورنر کی اس خواہش نے پنجاب کے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کو جو اس زمانے میں میجر تھے، اُردُو نظم کے سلسلے میں ایک تحریک شروع کرنے پر اکسایا۔"(۵۳)

انجمن پنجاب کے تحت ہونے والے مشاعروں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم اس کا ایک مقصد ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے نزدیک یہ بھی تھا کہ:

"نئی تعلیم یافتہ پود جدید مغربی افکار و خیالات سے آراستہ ہو سکے۔ حالی اور آزاد نے اس مشاعرے سے کچھ عرصہ پہلے بھی چند ترجمہ شدہ انگریزی نظموں کو اُردُو کا جامہ پہنایا تھا۔"(۵۴)

مگر حقیقت یہ ہے کہ باقاعدہ ایک تحریک کی صورت انجمنِ پنجاب کے مشاعروں ہی سے پیدا ہوئی۔ ابتدا میں مولانا محمد حسین آزاد اور بعد ازاں، الطاف حسین حالی کی جدید نظمیں زیادہ تر اسی تحریک کا نتیجہ ہیں۔ یہ سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور دیگر شعرا کی نظمیں موضوعاتی شاعری کا پُر اثر اور نیا پیرایۂ اظہار لے کر جہاں اُردُو نظم کی شعری تاریخ میں عصری ضرورت کے ساتھ سامنے آئیں، وہیں ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائڈ کی تحریکی مساعی سے اُردُو شعر و ادب کے ایک نئے دور کا سرمایۂ آغاز بھی ہیں۔

از اول تا آخر مسیحی اہلِ ادب کی خدمات کا دائرۂ کار صرف ادبی خدمات تک محدود نہ رہا بلکہ اس کا ایک اہم مقصد انگریزی تعلیم کا فروغ اور اس حوالے سے عیسائی مشنریوں کے دائرۂ اثر کو وسیع کرنا بھی تھا۔ اگرچہ مسیحی اہلِ ادب سے مراد وہ اہلِ ادب ہیں جو مذہبی طور پر مسیحی ضرور ہیں مگر اُن کا علمی کام خاص طور پر ادب کے حوالے سے کسی مذہبی تعصب کے تحت نہیں تھا بلکہ خالصتاً علمی بنیادوں پر تھا۔ مذہبی طور پر عیسائی مشنریوں نے جو کام انجام دیا وہ اپنی جگہ ایک مذہبی ضرورت ضرور رہی ہے مگر ایسا نہیں کہ اُن مخلصینِ ادب کے کام کو محض اس بنیاد پر کہ ہندوستان میں ابتدائی عہد میں جن اہلِ مذہب نے اپنی مذہبی تبلیغ کا دائرۂ کار بڑھانا چاہا، اُن کے مذہب یعنی مسیحی اہلِ ادب کی اُردُو زبان و ادب کی خدمات کو کوئی دوسرے معنی پہنا دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں اگرچہ یورپی اہلِ قلم بقول عطش درانی:

> ''زیادہ تر عیسائی مشنریوں سے منسلک تھے اور مذہبی ضرورت کے تحت اُردُو میں ترجمہ اور تالیف کا کام کرتے تھے۔''(۵۵)

اور بعض حقائق و واقعات اس امر کی نشان دہی بھی کرتے ہیں، جس کو عطش درانی نے اپنے خاص نقطۂ نظر کے تحت پیش کیا ہے کہ:

''انگریزوں کی تعلیم کا ایک بڑا مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا، چناں چہ ایسے ادب کی تخلیق پر زور دیا گیا جو مذہب خصوصاً اسلام سے بیگانہ کرتا تھا، البتہ گولڈن ٹریژری کی نظمیں اور بنیان کے ناول وغیرہ ترجمے کیے جانے لگے۔ دوسری طرف عیسائی تبلیغی لٹریچر کی اُردُو میں اشاعت عام ہو گئی۔''(۵۶)

عطش درانی اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

> ''استشراق کی آڑ میں اسلام اور مشرقی علوم کے ایسے مغالطے کا آغاز کیا گیا کہ مسلمانوں اور مقامی لوگوں کو یقین ہو جائے کہ مذہب غلط چیز ہے، خصوصاً اسلام اصل میں ایک

غلط اور بگڑا ہوا مذہب ہے اور اہلِ ہند علمی لحاظ سے پس ماندہ اور تحقیق و تدریس میں کورے ہیں۔ غیر جانب داری اور تحقیق کی آڑ میں یہ یقین دلایا گیا کہ صرف عیسائی اور یہودی اساتذہ ہی علمی اور تحقیقی مرتبے پر فائزہ ہو سکتے ہیں، چناں چہ فیصلہ ہوا کہ مقامی لوگوں کے لیے اورینٹل یونیورسٹی قائم کر دی جائے۔ اس شان دار تجویز کا آغاز اورینٹل کالج سے ہوا۔"(۵۷)

مگر یہ دل چسپ اور حقیقت افروز پہلو بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ خود اورینٹل کالج کے قیام اور اس کے نظامِ تعلیم کے تحت اسلامی عقاید و افکار پر کوئی زد نہیں آئی بلکہ ڈاکٹر لائٹنر جیسے محقق اور صاحبِ علم نے علومِ شرقیہ کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ڈاکٹر لائٹنر نے مولانا محمد حسین آزاد کی مدد سے "سنینِ اسلام" جیسی تصنیف محض اس لیے تالیف کی اور اس کی اشاعت کا مقصد بھی صرف یہ تھا کہ کم خواندہ مولوی حضرات یا مذہبِ اسلام کی تاریخ سے ناواقف طلبا اپنی تاریخ سے آگاہ ہو جائیں۔ یہی مقصدِ وحید اس تالیف کا سبب تھا کہ انھوں نے نہایت مختصر پیرایے میں ایک ایسی کتاب تالیف کر دی جس کے مطالعے سے اہلِ اسلام کو اپنی تاریخ کی جانب رغبت پیدا ہو جائے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اظہر من الشمس ہے کہ جب مکمل طور پر انگریزوں (عیسائیوں) کے ہندوستان میں قدم جم گئے تو معاشرتی سطح پر میل جول میں انسانی احساسات و جذبات کے تحت ہمدردانہ تعلق بھی پیدا ہو گیا اور انھیں اُردُو زبان سے دلی انسیت پیدا ہو گئی، چناں چہ انھوں نے یہاں کے مقامی اہلِ ادب سے نہ صرف بڑھ چڑھ کر کام کیا بلکہ اُردُو زبان کی خدمت میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ جن اہلِ یورپ نے مذہبی ضرورت کے تحت کام کیا، اس کا بیان مقصود و منشا بھی نہیں، البتہ یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ مذہبی کتابیں جیسے انجیلِ مقدس کے اُردُو تراجم اور مسیحیت سے متعلقہ دیگر کتابیں اُردُو میں لکھی گئیں، وہ بھی ایک لحاظ سے اُردُو زبان کا اعتراف اور اس کی مسلمہ اہمیت کو اجاگر کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی رہیں۔

المختصر، بیسویں صدی میں ہندوستان کے برطانوی دورِ حکومت کے دوران مسیحی مستشرقین اُردُو کے اس وقیع سلسلے کے آخر میں گراہم بیلی نے ۱۹۳۲ء میں History of Urdu Literature کے نام سے تاریخِ ادبیاتِ اُردُو کا کام مکمل کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جب آزاد کی "آبِ حیات" اور اُردُو شعر و ادب پر مقامی

مصنفین کی کتابیں شائع ہونا شروع ہو گئیں تو بیرونِ ہندوستان میں کہیں نہ کہیں اُردُو پر کام ہوتا رہا اور معدودے چند ہندوستان میں بھی یہ سلسلہ کسی نہ کسی انداز میں جاری رہا، بالخصوص ہندوستان میں برطانوی باشندوں کی تحقیقِ زبان اور تاریخ ادب پر وہ توجہ نظر نہیں آتی جو اس سے قبل وہ پورے جوش و خروش سے سرانجام دے چکے تھے، تاہم بیرونِ ہندوستان مسیحی اہلِ ادب کے اگر مجموعی کام پر نظر دوڑائی جائے تو ہندوستان اور پاکستان سے باہر غیر ممالک میں اُردُو اہلِ ادب کے تحقیقی کام کا ایک لامتناہی سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر اہلِ یورپ اور امریکہ میں یونیورسٹیوں کے علاوہ ذاتی علمی دل چسپی اور اجتماعی کوششوں کے نتیجے میں ہونے والے کام کا ایک نامختتم سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان میں البتہ شاعری کے حوالے سے خود انگریز مسیحی شعرا نے اپنا سفر جاری رکھا۔

حوالہ جات

۱۔ شیخ محمد اکرام، آبِ کوثر (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۸۷ء)، ص ۶۴۔

۲۔ جمیل جالبی، تاریخِ ادبِ اُردو (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۵ء)، ص ۱۱۳۔

۳۔ ایضاً، ص ۱۵۔

۴۔ حکیم شمس اللہ قادری، ملیبار: ملخص (علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی پریس، ۱۹۳۰ء)، ص ص ۵۸، ۶۴۔

۵۔ پروفیسر سید محمد سلیم، مغربی زبانوں کے ماہر علما (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۱۵ء)، ص ۲۳۔

۶۔ ایضاً، ص ص ۲۳، ۲۴۔

۷۔ بنگلوی محمود خاں محمود، تاریخ سلطنتِ خدادادِ میسور (لاہور: یونائیٹڈ پبلشرز، ۱۹۴۵ء)، ص ۳۱۸۔

۸۔ پروفیسر سید محمد سلیم، مغربی زبانوں کے ماہر علما (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۱۵ء)، ص ۳۰۔

۹۔ شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر (لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۳۸۔

۱۰۔ ڈاکٹر برنیر، شاہجہاں کے ایامِ اسیری اور عہدِ اورنگ زیب / مترجم: سید محمد حسین (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۰ء)، ص ۵۹۷۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۹۷۔ (ڈاکٹر برنیر نے عیسائی مشنریوں اور ان کی تبلیغی کاوشوں کے سلسلے میں کچھ اور تفصیلات بھی بیان کی ہیں اور پھر ایک معاصر سفر نامہ نگار کے طور پر اس کے بیانات کی صحت کے طور پر کسی شک و شبہہ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا مگر اسے کیا کہا جائے کہ بعض دوسرے واقعات میں ڈاکٹر برنیر نے اپنے سفر نامہ میں بعض ایسے واقعات بھی تحریر کیے ہیں جو دوسری معاصر تاریخوں میں کہیں نہیں ملتے۔ اس

دور میں ملا عبد القادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" اور خافی خاں نظام الملک کی "منتخب اللباب" اور میرزا محمد عرف معتمد خاں بخشی کی "اقبال نامہ جہانگیری"، معاصر شہادتوں پر مشتمل یہ وہ تاریخیں ہیں جن کی تاریخی صحت و استناد و ثقاہت میں کسی مؤرخ نے بھی شک و شبہہ کا اظہار نہیں کیا۔ ان تاریخوں میں کہیں بھی بعض ایسے واقعات کا اندراج نہیں ملتا، جو جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب عالم گیر کے بارے میں ڈاکٹر برنیر نے تحریر کیے ہیں، تاہم یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض اوقات ان میں اختلافِ رائے بھی ہو سکتا ہے، تاہم کچھ ایسے واقعات جن کو عوام میں بھی عام ہونا چاہیے ڈاکٹر برنیر کے بیان کے مطابق عوام میں اس کا تذکرہ تھا، متذکرہ تاریخوں میں اس کا ذکر کیوں نہ ہو سکا؟ یہ سوال ابھی تشنۂ تحقیق ہے۔)

۱۲۔ بنگلوی محمود خاں محمود، تاریخِ سلطنتِ خداداد میسور (لاہور: یونائیٹڈ پبلشرز، ۱۹۴۵ء)، ص ۴۹۸۔

۱۳۔ یہ کتب خانہ انڈیا آفس لائبریری لندن میں منتقل ہو چکا ہے۔

۱۴۔ نصیر الدین ہاشمی، "ٹیپو سلطان کی علمی و سماجی خدمات"، مضمون مشمولہ "بصائر" ٹیپو سلطان نمبر، مرتبہ: سید معین الحق، (کراچی: شمارہ جنوری، اپریل ۱۹۶۴ء)، ص ۳۱۵۔

۱۵۔ تحفۃ المجاہدین کا اُردو ترجمہ حکیم شمس اللہ قادری نے کیا اور اپنے مقدمہ و تعلیقات کے ساتھ شروانی پرنٹنگ پریس، علی گڑھ سے ۱۹۴۲ء میں شایع کیا۔

۱۶۔ "بصائر"، ٹیپو سلطان نمبر، ص ص، ۳۴۹، ۳۴۸۔

۱۷۔ جمیل جالبی، تاریخ ادبِ اُردو، جلد سوم (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۰۸ء)، ص ۵۷۹۔

۱۸۔ عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد (دہلی: انجمنِ ترقیِ اُردو، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۰۔

۱۹۔ مولوی محمد سردار علی، یورپین شعرائے اُردو (حیدر آباد، دکن: نظام دکن پریس، ۱۳۴۴ھ)، ص ۴۔

۲۰۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء)، ص ص ۷۸، ۷۷۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۔

۲۴۔ عطش درانی، اُردو زبان اور یورپی اہلِ قلم (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۰۔

۲۵۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء)، ص ۸۲۔

۲۶۔ عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد (دہلی: انجمنِ ترقیِ اُردو، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۲۔

۲۷۔ ایضاً، ص ص ۱۲، ۱۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۷۔

۳۰۔ عطش درانی، اُردو زبان اور یورپی اہلِ قلم (لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۰۔

۳۱۔ اُردو قواعد کے ضمن میں ۱۷۷۸ء میں Grammatica Indostanica کے زیرِ عنوان پرچگالی زبان میں جو کتاب شایع ہوئی، ممکن ہے، یہ وہی کتاب ہو، جس کا ذکر سردار علی نے اپنے مختصر تذکرہ "یورپین شعرائے اُردو" میں کیا ہے، نیز دیکھیے: داستانِ تاریخ اُردو، ص ۱۳۔

۳۲۔ عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد (دہلی: انجمنِ ترقیِ اُردو، ۱۹۷۹ء)، ص ۱۳۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۸۳۔

۳۴۔ عطش درانی، اُردو زبان اور یورپی اہلِ قلم (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ص ۴۰۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۳۶۔ سید محمد، اربابِ نثر اُردو (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ۲۰۱۱ء)، ص ص ۱۲، ۱۱۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۶۔

۳۸۔ عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد (دہلی: انجمنِ ترقیِ اُردو، ۱۹۷۹ء)، ص ص ۲۴، ۲۳۔

۳۹۔ سید محمد، اربابِ نثر اُردو (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، ۲۰۱۱ء)، ص ۲۲۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۴۔

۴۲۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء)، ص ۸۶۔

۴۳۔ حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اُردو (کراچی: اُردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء)، ص ۸۷، ۸۶۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۸۷۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۸۹۔

۴۶۔　ڈاکٹر اسلم فرخی کے مطابق: ’’طبقات الشعرا محض گارسیں دتاسی کا ترجمہ نہیں بلکہ کریم الدین کی محنت، ذوق و شوق اور تلاش و تحقیق نے اسے اُردو کا نہایت اہم تذکرہ بنا دیا ہے۔‘‘ محمد حسین آزاد، جلد دوم، ڈاکٹر اسلم فرخی، ص ۴۴۔

۴۷۔　گارسیں دتاسی، تاریخ ادبیات اُردو/ مترجم: لیلیان سیکسٹن نازرو، ترتیب و تقدیم اور تدوین: ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی: پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۵ء)، ص ص ۲۲،۲۱۔

۴۸۔　ایضاً، ص ۳۲۔

۴۹۔　شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، خطباتِ سرسید (لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۷۳ء)، ص ۱۸۸۔

۵۰۔　صفیہ بانو، انجمنِ پنجاب۔۔۔ تاریخ و خدمات (کراچی: کفایت اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)، ص ص ۱۲۰،۱۰۵،۱۰۴۔

۵۱۔　سید عبدالحیی، گلِ رعنا (اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، س ن)، ص ۴۶۷۔

۵۲۔　صفیہ بانو، انجمنِ پنجاب۔۔۔ تاریخ و خدمات (کراچی: کفایت اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)، ص ۴۲۴۔

۵۳۔　اسلم فرخی، محمد حسین آزاد، جلد اول (کراچی: انجمنِ ترقیِ اُردو، ۱۹۶۵ء)، ص ۳۳۴۔

۵۴۔　غلام حسین ذوالفقار، اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء)، ص ۳۳۹۔

۵۵۔　عطش درانی، اُردو زبان اور یورپی اہلِ قلم (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء)، ص ۸۰۔

۵۶۔　ایضاً، ص ۱۵۔

۵۷۔　ایضاً، ص ۱۵۔